اور وہ کالی ہو گئی

سائرہ ہاشمی

پیش کش: ملت ڈاٹ کام

www.millat.com

اور وہ کالی ہو گئی

ان دنوں میرے شوہر کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا تھا۔ کوئٹہ برف سے ڈھکا ہوا
تھا اور رضیہ بی بی کی آنکھیں گہرے گدلے آنسوؤں سے۔ رضیہ میرے گھر
کام کرتی تھی اور اس کا شوہر میرے میاں کے دفتر میں چپراسی تھا۔

جب میں وہاں پہنچی تو جنوری کی یخ ہوائیں بند کھڑکیوں اور
دروازوں سے ٹکرا کر چکروں میں گھومتیں۔ برف کے نرم گالوں سے اُلجھتیں
سنسان گلیوں اور دیوران راہوں پر سفر کرتی ہوئی پتھریلے برف پوش
پہاڑوں کی طرف پرواز کر جاتیں۔ میں جو لاہور کی گہما گہمی کی عادی تھی اس

تنہائی بھرے ماحول سے آداس ہوگئی۔ یاسے موسم میں دل انجانے بوجھ سے دب جاتا ہے۔ میرا دل بھی اس وشعت بھری تنہائی میں گزری محرومیوں اور ادھوری خواہشوں سے نڈھال ہو جاتا۔ میرے میاں اکثر دورے پر رہتے اور رگ جاں میں گھلنے والی ہزاروں چھوٹی بڑی محرومیاں دل کے اندر آہستہ آہستہ سرکنے لگتیں جس طرح زیرزمین کاریز میں برف کی سخت تہہ کے تلے سرکتا ہوا پانی۔

شاید عورت کے جنم میں ہی دکھوں کا پانی گھول دیا گیا ہے میں جانتی تھی۔ رضیہ کی آنکھیں ایک بڑے المیے کی تمہید ہیں۔ لیکن میں جو ایک اعلیٰ افسر کی بیوی تھی اس کے ساتھ دوسراتھ کی سطح پر نہیں اتر سکتی تھی۔ میں دن کا زیادہ حصہ کوئلوں سے دہکتے آتشدان کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتی یا کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی۔ کھڑکیوں کے شیشے برف کی سفیدی میں دھندلا جاتے اور میرے اندر اداسی بھرا اکیلا پن اور بھی گہرا ہو جاتا۔ میرے دونوں بیٹے اپنی اپنی وڈیو گیمز میں الجھے رہتے یا سپرمین اور ٹارزن کی رنگین تصویروں والے کومکس پڑھتے رہتے۔

سپر مین جو افلاک کو زیر دام لا سکتا ہے ٹارزن جو جنگل کے مہیب سایوں پر حکومت کرتا ہے ذہن کے لیے نئے خواب خواہشوں کی نئی جہت۔

میرا چھوٹا بیٹا کہتا "اموں جان دیکھیں سپر مین نے بلند عمارت سے گرتی ہوئی لڑکی کو تھام لیا ہے کتنا بہادر ہے۔ یہ کاش میں بھی سپر مین ہوتا۔ اس کی آواز میں حسرت در آتی اور میں سوچتی ہوں زندگی میں ہر لڑکی کو ایک سپر مین کی ضرورت رہتی ہے۔ جو اسے گرنے سے بچا کر اپنے رنگ محل میں لے جائے اور رضیہ کے سپر مین نے شاید اسے آنسوؤں کے حوالے کر دیا ہے حالانکہ کسی سپر مین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میرا شوہر جمیل احمد بھی تو سپر مین ہی ہے جس نے مجھے عام زندگی سے بلند مقام پر تھام رکھا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے اگر وہ مجھے گرا دے تو شاید میں بھی صرف آنسو بہاتی رہوں رضیہ بی بی کی طرح۔

رضیہ بی بی اپنی میلی کچیلی پشک کی آستینیوں سے آنسو پونچھتی رہتی ہے۔ یہ پشک شاید کبھی نئی اور رنگین ہو گی۔ طرح طرح کے دھاگے کے پھولوں سے مزین چمکتے شیشوں سے روشن۔ لیکن اب سب کچھ بڑا بوسیدہ اور

بے رنگ ہو چکا ہے۔ صرف اس کے آنسو نئے ہیں جو ہر آن اس کی آنکھوں کو سیراب کیئے رکھتے ہیں۔

میرے بڑے بیٹے کو رضیہ کی روتی آنکھیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ وہ اکثر کہتا ہے ''اموں آخر آپ اس گندی عورت کو کیونکر برداشت کر رہی ہیں۔ مجھے گھن آتی ہے۔ خدارا اسے نکال دیں۔'' میں اسے سمجھانا چاہتی ہوں۔ عورت کے اندر بھرے دکھوں سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں لیکن وہ ان باتوں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لیے میں چپ رہتی ہوں۔

باہر کی دنیا کے ساتھ میرا رابطہ صرف رضیہ بی بی کے ذریعے ہی قائم ہے اور پھر اس کا شوہر سرکاری نوکر ہے۔

ایک روز میں نے لاتعلقی سے پوچھا ''رضیہ ب بی تم روتی رہتی ہو۔ یا تمہاری آنکھوں کو کوئی بیماری ہے۔'' اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنا سر جھکا لیا۔ اور پھر اس کی ناک کا لونگ اور کانوں میں پڑی بڑی بڑی بالیاں ہچکیوں کے زور سے ہلنے لگیں۔ اس کے گلے میں پڑی بڑی بڑی موتیوں کی مالائیں آواز پیدا کرنے لگیں...... اور وہ باہر چلی گئی۔

”جمیل احمد نہ جانے کب آئیں گے ______ انتظار ______“میں رضیہ بی بی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

رضیہ کے شوہر جاناں نے تو اسے کبھی کچھ نہیں کہا۔لگتا ہے جیسے دونوں کسی دکھ کی ڈور سے آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔زیادہ نزدیک کبھی کبھار تو مجھے ان دونوں پر بڑا رشک آتا ہے اور میرے ذہن کی ساری سوچیں گڈ مڈ لگتی ہیں۔ ہر حال میں زندگی کو گزارنا بھی تو ایک بہت بڑی مجبوری ہے۔

لان کا سبزہ پھولوں کی رنگینی درختوں کی ہریاول سب کچھ ایک لامتناہی خزاں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔رضیہ ننگے پاؤں باہر ڈھکی کاریز کے گڑھے سے پانی لاتی ہے۔میں نے اکثر اسے جوتی پہننے کے لیے کہا ہے وہ جوتی پہنتی ہے تو اسے چلنا نہیں آتا۔وہ زور زور سے ہنستی ہے اور پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہتی ہے ”ہماری نانی دادی یا ماں......وہ جوتی نہیں پہنتی تھیں۔میں نے بھی تو اماں بچپن سے جوتا نہیں پہنا نا گھبراہٹ

ہوتا ـــــــ چوڑو چوڑو جانے دو“ اور وہ اسے اتار کر کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔

میں پھر اس کی بہتی آنکھوں کے بارے میں سوچنے لگتی ہوں۔عورت ـ ـ ـ ـ ـ ـ عورت کا دل اس کا وجود اس کی روتی آنکھیں ـــــــ میرا اداس دل ـــــــ دل ہمیشہ مسکراتا کیوں نہیں رہتا ـــــــ مجھے ضرور پوچھنا چاہیے۔رونا نحوست ہے۔ماتم ہے اور بستے گھروں میں ماتم نہیں ہونا چاہیے ـــــــ لیکن میرا بلند درجہ اس کا دکھ بانٹنے نہیں دیتا۔بڑے رتبے پر ہونا انسان کو خود دوسرے سے الگ اور تنہا کر دیتا ہے۔اور ہم اس پر دل ہی دل میں فخر کرنے لگتے ہیں،اور پھر اکیلا پن باقی رہ جاتا ہے۔

میرے بچے کسی نہ کسی کام میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف رہتے ہیں اور میں باہر تیز یخ ہوا کو اجاڑ ڈالوں اور ٹنڈ منڈ درختوں کی برہنہ شاخوں کو جھلاتا دیکھتی رہتی ہوں۔میرے بیٹوں نے کبھی موسم کی سختی کا گلہ نہیں کیا۔

رضیہ چائے لے کر آئی تو میں نے کہا۔ ''رضیہ بی بی اندھا ہونا بڑا تکلیف دہ ہے یہ آنسو تو تمہاری آنکھوں کا نور ہیں جنہیں تم ہر وقت ضائع کرتی رہتی ہو۔ صاحب کے دوست ڈاکٹر شریف جب انہیں ملنے کے لیے آئیں تو تم اپنی آنکھیں انہیں ضرور دکھانا۔ مفت دیکھ لیں گے فکر نہ کرو۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے یوں آنسو بہنے لگے جیسے کمزور بند ایک دم ٹوٹ کر اس کے سارے وجود کو بہا لینا چاہتا ہو______ میں نے اس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ رکھ دیا______ تو یہ آنسو دکھ کے تھے______ اس انجانے غم کی تیز لہر میرے اندر بھی اتر آئی______۔

''رضیہ بی بی کچھ تو کہو______ کچھ تو بتاؤ۔''

''اماں کیا کہوں______ دکھ ہے جو میرے دل کو اپنے پنجوں میں جکڑ کر زخمی کرتا رہتا ہے میں مر بھی نہیں سکتی______ سوچتی ہوں پیدا نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ پھر وہ یوں نہ مرتی______ اس کی چیخیں سارا وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اور پھر میرا تن من ایک ماتم میں ڈھل جاتا

ہے______کیا کروں اماں کیا کروں______''اور وہ اپنی چھاتی پیٹنے لگی۔اپنے بال نوچنے لگی______مجسم غم______سراپا احتجاج______

''کون تھی وہ تمہاری۔''

''وہ میری بیٹی تھی______میری روح تھی میری جان تھی'' وہ مسلسل ماتم کیے جارہی تھی______

''نہیں اماں______وہ کالی ہوگئی تھی______اس کی قسمت میں لکھا تھا۔''

''یہ کالی ہونا کیا ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہے اماں______جب بیٹیوں کی بدقسمتی زمین پر اترتی ہے تو وہ کالی ہو جاتی ہیں______انہیں کالا کر دیا جاتا ہے زبردستی______اور پھر انہیں کوئی سفید نہیں کرسکتا______''وہ یک دم یوں چپ ہوگئی جیسے اندر باہر سے ویران ہوگئی ہو۔اس کی ماتم بھری آواز آتشدان کے چٹختے کوئلوں کی آواز کے ساتھ مل کر بوجھل ہوا کی طرح بند

کمرے میں چکر کاٹنے لگتی تھی۔

میں نے سوچا وہ اپنے غم پر قابو پالے گی تو میں اس سے اس کی کہانی سنوں گی۔لیکن وہ اٹھ کر چلی گئی اور اس کے آنسو مجھے دوبارہ اس قصے کو دہرانے سے روکتے رہے۔

جمیل احمد دورے سے واپس آ گئے۔ڈاکٹر یوسف انہیں ملنے آئے۔جب رضیہ بی بی چائے کی ٹرے لے کر اندر آئی تو ڈاکٹر یوسف نے پوچھا۔

"رضیہ بی بی اچھی تو ہو______اب تو چھلانگ لگا کر مرنے کا ارادہ نہیں نا______"وہ ہولے سے مسکرائی اور دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے کہا۔"ڈاکٹر صاحب کیا آپ اس کی کہانی جانتے ہیں؟"

"اس کی کہانی _ _ _ _ _ _یہ اس اکیلی کی کہانی نہیں _ _ _ _ _ _یہ تو یہاں کی ساری عورتوں کی کہانی ہے______مجبور اور بے بس عورت کی کہانی______مرد کے

معاشرے کی۔ اس کے جبر کی کہانی۔"

میں نے رضیہ بی بی کی کہانی کے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک داستان بنائی ہے ــــــــ اس کے دکھ کو سمجھنے کے لیے مجھے بہت دن لگے ہیں۔

رضیہ بی بی تاج بی بی میر بخش سردار چنگیز خاں جاناں خاں کئی سپرز مین اور کمزور معصوم خوبصورت لڑکی۔ لیکن سپر مین نے اسے بلند عمارت سے نیچے گرنے دیا اور پھر اس کا خون سب طرف بکھر گیا ــــــــ ان چٹانوں پر جن پر تاج بی بی بیٹھی تھی۔ رضیہ کے دل پر جو اس کی ماں تھی ــــــــ میرے دل میں بھی میں جو اس کی کچھ نہیں لگتی۔

رضیہ بی بی اور اس کا شوہر جاناں خاں ٹمپل ڈیرہ کے پاس بہت سے انسانوں کی طرح پہاڑ کی کھوہ میں بنائے گئے ایک گھر میں بیٹی تاج بی بی اور آٹھ دس بکریوں کے ساتھ رہتے تھے ــــــــ ایک ٹوٹا بکس چند مٹی کے برتن اور اوڑھنے کے لیے ایک دو بوسیدہ لحاف ان کی کل کائنات تھے۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے آپ کو غریب نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ تاج بی بی کا حسن ان کی سب سے بڑی دولت بننے والا تھا۔

گرمیوں میں تپتی زمین اور بے بادل روشن آسمان تلے تاج بی بی برہنہ پاؤں پتھروں کو پھلانگتی بھیڑ بکریوں کے پیچھے تتلی کی مانند اڑتی تو رضیہ بی بی سوچتی ______ بس تین چار سال اور ______ اور پھر ہم غریب نہیں رہیں گے مجھے ابھی سے اپنے بھانجے میر بخش سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ ڈھیر سارے ولور کا بندوبست کر لے ______ کتنی اجلی اجلی سی ہے میری بیٹی پندرہ ہزار سے کم کی تو کسی طور نہیں وہ آٹے کو پتھر کے گرد لپیٹ کر دہکتے چولہے میں ڈالتے ہوئے سوچتی رہتی جاناں خاں رسی بٹتے ہوئے تصور ہی تصور میں ایک بڑھیا بندوق کندھے پر رکھے بہترین کتوں کے ساتھ پہاڑوں پر شکار کرنے لگتا۔ جیسے جیسے تاج بی بی بڑی ہو رہی تھی ویسے ویسے اس کو اپنی پشتو پرانی توڑیدار بندوق بری لگنے لگی تھی۔

وہ دونوں اپنی اپنی خواہشوں کے تعاقب میں اپنی بیٹی کے ایک ایک انداز پر فریفتہ ہوتے رہتے اور تاج بی بی اپنی قسمت سے بے خبر چٹانوں کی روئیدگی سے اگتے تیز خوشبو والے پھولوں کو توڑ کر انہیں ایک دوسرے کی ڈنڈیوں میں پھنسا کر لمبا سا ہار بنا لیتی اور گلے میں ڈالے سہج سہج قدموں

سے ایک سے دوسرے پتھر پر اترتی بکریوں کے پیچھے چل پڑتی۔ اس کا سر تیز پھولوں سے اٹھتی تیز باس سے بوجھل ہو جاتا تو اسے لگتا جیسے وہ چڑیا بنی بہت اوپر نیلے آسمان کے پاس پاس پرواز کر رہی ہو۔

سورج کسی بڑی سی چٹان کے پیچھے چھپ جاتا______اس کا کتاب بکریوں کو گھیرنے کے لیے بھونکنا شروع کر دیتا تو اس کی ماں کی پکار چٹانوں سے ٹکراتی گونج در گونج اسے گھیرنے لگتی۔

بی بی ''تاج

______ہو______او______او''وہ بھی منہ کے آگے ہاتھوں کا بھونپو بنا کر جواب دیتی۔ اس کی بکریاں سر اٹھا کر اسے دیکھتیں میں میں کرتیں اور وہ سب خشک ہوتے کسی برساتی نالے کے گڑھے میں بھرے پانی پر جھک جاتے وہ پانی نہ جانے زمین کے بطن سے کہاں سے پھوٹتا پھر وہ سب چٹانوں پر چڑھتے گھر کو چل پڑتے وہ موسم کی آخری کھمبیوں کو دامن میں جمع کرتی رہتی _ _ _ _ _ماں کہتی ''تاج بی بی گلے میں پھول مت پہنا کرو نہیں تو بگولے کا جن______

کسی روز تمہیں اٹھا کر لے جائے گا۔"

بگولے کا جن ______ لیکن ماں مجھے تو آج تک بگولے کا جن نظر نہیں آیا۔ وہ میرے کتے سے ڈرتا ہے نا ______ اور ماں کتنا بڑا ہوتا ہے وہ جن ______ وہ شوق سے پوچھتی اس کے اندر خوف اور تجسس دونوں گڈمڈ ہونے لگتے۔

"نہیں اسے کوئی نہیں اٹھا سکتا ______ میں بڑی مسجد کے ملا سے تعویز کروا کر لاؤں گی اس کے بڑے ہونے پر میں خود چلی جایا کروں گی بکریوں کے ساتھ ابھی تو فکر کی بات نہیں ہے۔" وہ اپنے آپ کو تسلی دیتی ______ تاج بی بی اور دولت ______ روپوں کا ڈھیر رضیہ بی بی کے تصور میں بڑھنے لگتا ______ اتنا بڑا جتنا کہ اس کے چھوٹے سے گھر میں بھی سما نہیں سکتا _ _ _ _ _ _ تب میں بڑا سا گھر بناؤں گی ______ اور" ______ لیکن وہ آگے سوچ نہ پاتی اس سے آگے خواہشوں کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں جانتی تھی بس سوچ سکتی تھی اتنا ہی جتنا اس نے زندگی بھر دیکھا تھا ______ وہ بھی تو تاج بی بی کی طرح

چٹانوں کے درمیان ہی بڑی ہوئی تھی اور پھر جاناں خاں اسے پانچ ہزار ولور دے کر بیاہ کر یہاں لے آیا تھا ـــــــ اور تاج بی بی ـــــــ لیکن میری بیٹی مجھسے بہت زیادہ خوبصورت ہے وہ غرور سے سوچتی۔

ایک دن وہ خاص طور پر اپنی بہن کے گھر دوسرے دیرے گئی اور اس نے تاج بی بی کے حسن کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ دوسرے کمرے میں بیٹے میر بخش کے دل میں اسے دیکھنے کی طلب شدت سے جاگ اٹھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بہت بڑا جرم ہے پندرہ ہزار روپیہ ـــــــ اس کے جوان دل میں خوشی اور رنج کی جوالاسی جلنے لگی۔ وہ جانتا تھا تاج بی بی اس کی منگیتر تھی اور وہ پہاڑوں کی برف کی طرح اجلی اور پاکیزہ تھی اور اسے پندرہ ہزار ادا کر کے ہی اس تک پہنچانا تھا۔

تاج بی بی کی ماں کے جانے کے دن بعد وہ کوئٹہ شہر مزدوری کے لیے چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ صبح سے شام تک ان راہوں پر چلتا رہا جو اس کی منگیتر کے گھر کی طرف جاتی تھیں۔ ایک بار صرف ایک بار ـــــــ وہ اپنے دل کے اندر امنڈتے شوق کو سی طور دبا نہیں سکا

تھا۔شوق کی ننھی سی لواس کے سارے وجود کو تپا رہی تھی۔

تاج بی بی ہمیشہ کی طرح چٹانوں کے درمیان پھولوں کو ڈھونڈ کر اس کا ہار بنا رہی تھی۔میر بخش کا دل چاہا وہ زور سے پکارے _ _ _ _ _ _تاج بی بی

لیکن وہ چٹان کے پیچھے چھپا ______او______ہواو______ اسے دیکھتا رہا______اور جب اس کی ماں کی آواز وادیوں میں گونجنے لگی تو اس نے بھی اپنی آواز کو اس گونج میں شامل کر دیا______تاج بی بی ہو______او______او______دور وادی میں نیچے گرد کا بگولا آٹھ رہا تھا______اور تاج بی بی کو لگا جیسے گولے سے کوئی اسے پکار رہا ہو۔تاج بی بی _ _ _ _ _ تاج بی بی _ _ _ _ _ محبت بھری پکار _ _ _ _ _شوق ہی شوق _ _ _ _ _ _ ''بگولے کا جن''______وہ خوف زدہ ہو کر کلانچیں بھرتی گھر کی طرف دوڑ پڑی اور وہ چٹان کے پیچھے چھپا چھپا قہقہے لگانے لگا۔پھر یہ قہقہے بھی تاج بی بی کا پیچھا کرنے لگے______ہا آ______ہا ہا ہا______

پندرہ ہزار روپیہ اور تاج بی بی کا خوبصورت چہرہ ــــــــ ہاں میں جمع کروں گا اور پھر اسے اپنے گھر لے جاؤں گا ــــــــ اس نے واپس جاتے جاتے سوچا ـــــــ پندرہ ہزار روپیہ اور تاج بی بی

ہو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ تاج بی بی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

او ــــــ ہو ــــــ او ــــــ آواز اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی ــــــ

جب تاج بی بی کو اپنے منگیتر میر بخش کے وجود سے آگاہی ہوئی تو اسے شہر گئے تین برس ہو چکے تھے۔تاج بی بی کی مینڈھیاں گوندھتے گوندھتے اس کی ماں کے ہاتھ دکھنے لگتے اور اس کے لباس کے لیے اس بار کپڑا ابھی زیادہ خریدنا پڑا تھا۔

"پتہ نہیں کب ہوگا اس کے پاس پندرہ ہزار روپیہ اور کب وہ لے جائے گا تاج بی بی کو" رضیہ کو تاج بی بی کا چودہ سالہ وجود چودہ پہاڑوں کی طرح بوجھل لگ رہا تھا۔اسے مردوں کی نظروں سے خوف آتا تھا ــــــ میر بخش اس کا بھانجا تھا۔اس کا اپنا اور تاج بی بی کا بچپن کا

منگیتر۔

اب تاج بی بی بھی بھیڑ بکریوں کو ہانکتے پتھروں کو پھلانگتی تو اس کے قدم خود بخود رک جاتے اسے لگتا کوئی کسی چٹان کے پیچھے چھپا اسے پکار رہا ہو _ _ _ _ _ _ تاج بی بی ___ ہو___ او___ او___ اور پھر وہ ہنسی کی آواز جھاڑیوں کے سایوں اور چٹانوں کی درزوں سے اس کا تعاقب کرنے لگتی۔ وہ برساتی نالے کے کنارے چپ چاپ بیٹھ جاتی۔ پھر ہر چٹان سے ایک ہیولہ ابھرتا جس کا چہرہ میر بخش کا بن جاتا___ وہ سوچتی اور اپنے اندر آتی تبدیلی سے خوفزدہ ہو جاتی اس کا معصوم وجود اپنے اندر کسی بے کار نے کی آگاہی سے خستہ ہو رہا تھا_ _ _ _ _ _ میر بخش___ میر بخش___ اس کا دل آواز کی تکرار سے بھر جاتا۔

اس روز اس کا چہرہ چٹان کے مقابلے میں زیادہ ہی سرخ ہو گیا جب اس نے سچ مچ میر بخش کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔

"میں میر بخش ہوں _ _ _ _ _ تمہاری خالہ کا بیٹا_____ "کتا اور زور سے بھونکنے لگا تھا لیکن تاج بی بی نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا کوئی اپنوں کو بھی بھونکتا ہے" "میں بہت لمبا سفر کر کے آیا ہوں تمہیں دیکھنے_____ میں اپنے گھر بھی نہیں گیا"_____ میر بخش کی آنکھوں کی چمک اسے چندھیا رہی تھی۔

وہ پریشان اور خوفزدہ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں بتاؤ کیا میں تمہیں یاد آتا ہوں" میر بخش کی مدھم آواز میں جذبوں کی شدت تھی وہ شدت جو سوچوں کی آگ نے بھڑکائی ہوئی تھی_____

"اس نے سر جنبش سے اقرار کر لیا۔ بس اتنی سی تو بات تھی وہ دل ہی دل میں ہنسی پھر وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے دور نیچے بکریاں چر رہی تھیں کتا چٹانوں کی درزوں میں سونگھتا پھر رہا تھا_____ اور تاج بی بی کے دل کی آواز اس ساری خاموشی کو توڑ رہی تھی۔

جانے سے پہلے میر بخش نے کہا "خالہ کو نہ بتانا میں نے بھی ماں کو

نہیں بتایا۔'' اور پھر وہ ان منے دل سے بے نام پگڈنڈیوں پر چلتا واپس مڑ گیا۔ وہ اب وہاں اکیلی بیٹھی اس راز کے بوجھ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اندر باہر سے زیادہ روشن اور اجلی۔

اب وہ ہر روز اس چاپ کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ چاپ جس نے چٹانوں کو بڑا زندہ کر دیا تھا پھولوں کو زیادہ خوشبودار اور ہواؤں کو زیادہ سبک ـــــــ منتظر ـــــــ پندرہ ہزار روپوں کے ڈھیر کے پیچھے اس کی خوشیاں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ سوچتی جب وہ آئے گا تو میں گھر کی دیوار میں بنی چھوٹی سی کھڑکی میں سے اسے دیکھوں گی۔ وہ میرے لیے رنگین اور شیشوں والے لباس لائے گا ـــــــ اور شاید جوتی بھی ـــــــ وہ اپنے ننگے پاؤں کو چھوتی ـــــــ میر بخش کے تصور سے اس کا سارا وجود مہکا رہتا ـــــــ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ـــــــ

اب اس کے حسن کا تذکرہ آتے جاتے لوگ کرنے لگے تھے ـــــــ اور سردار چنگیز خاں کے کارندے جو پہاڑوں پر جڑی بوٹیوں کی کھوج میں پھرتے تھے اس کے ذکر کو تحفے کے طور پر اپنے سردار

کے حضور لے گئے۔

"سردار وہ وہیں چٹان پر بیٹھی تھی بالکل پری کی طرح نازک اور خوبصورت آپ کے گھر کی زینت بننے کے لیے موزوں۔"

سردار کے پاس بوریوں میں بھرے بڑے نوٹ تھے اسی روز اس نے چالیس ہزار دلور کے ساتھ ایک کارندے کو جاناں خاں کے پاس اس کی بیٹی کے رشتے کے لیے بھیج دیا۔

چالیس ہزار رضیہ بی بی اور جاناں خاں کو یقین نہیں آرہا تھا انہوں نے اتنے ڈھیر سارے روپے کبھی نہیں دیکھے تھے روپوں کو انگلیوں پر گننے کی کوشش میں ان کے ہاتھ دکھنے لگے۔اور پھر چنگیز خاں ان کے علاقے کا سردار تھا اور اس نے اس معمولی آدمی کی بیٹی کا رشتہ مانگا تھا لیکن رضیہ بی بی کے دل میں بہن اور بھانجے کا پیار بھی تھا______وہ______میر بخش سے ڈرتی بھی تھی۔

اس نے کہا"میر بخش کی بچپن کی منگیتر ہے وہ ایسا نہ ہو وہ انتقام لے______برباد کر ڈالے سب کچھ۔"

سردار کے کارندے نے اپنے شلوکے کی جیب سے نوٹوں کی گڈیاں ان کے سامنے ڈھیر کرتے ہوئے کہا۔

"جاناں خاں روپوں کا اتنا بڑا ڈھیر تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا ایک ہی بیٹی نے تمہارے نصیب جگا دیئے وہ علاقے کا سردار ہے اور بھی بہت کچھ دے گا تم گھوڑا خریدو یا بندوق کوٹھری مکان بناؤ یا اپنی زمین کو کاشت کرو______ تم بہت کچھ کر سکتے ہو اور تمہاری بیٹی سردار کے دل پر حکومت کرے گی خوب سوچ لو لیکن یاد رکھو وہ یہاں کا سردار ہے۔چٹانوں کے پتھر بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں ہلتے۔اور تم تو ایک معمولی آدمی ہو______"

جاناں خاں کو لگا جیسے وہ قارون کے خزانے کا مالک ہو اور رضیہ بی بی کے دل میں بھی اپنی بہن اور بھانجے کا خوف مدھم پڑ گیا______ چالیس ہزار روپیہ اور پندرہ ہزار روپیہ ان کی چیز جب اس قدر قیمتی ہے تو پھر وہ اسے سستے مول کیوں بیچیں______ غربت کو مٹا سکتا ہے وہ غریب تھے بہت غریب۔

جاناں خاں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر نوٹوں کے ڈھیر پر رکھ دیئے وہ کسی سے نہیں ڈرے گا اب وہ خود امیر ہو گیا تھا سردار کا رشتہ دار۔

اور تاج بی بی میر بخش سے کہہ رہی تھی میر بخش تم آتے ہو تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو ______ ''

میر بخش نے کہا ''ڈرنے کی کیا بات ہے میں تمہارا محافظ ہوں بس کچھ دیر بعد میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا پھر تم میری بکریاں چرانا میرے لیے مکیر ساگ کی میٹھی روٹی پوسن پکانا اور میری ماں کی خدمت کرنا ______ اور ______ ''

''لیکن مجھے تو پوسن پکانی نہیں آتی۔''

''میری ماں تمہیں سکھا دے گی۔''

''تم بہت دیر لگا رہے ہو کیا پندرہ ہزار روپیہ بہت ہوتا ہے۔''

''ہاں پندرہ ہزار روپیہ بہت زیادہ ہوتا ہے ______ میر بخش کے دل میں مایوسی اتر آئی تھی۔

تاج بی بی نے جاتی بہار کے پھولوں کا ننھا سا ہار بنا کر میر بخش کی طرف اچھال دیا پھول جو اس بے آب و گیاہ زمین کے سہاگ کی نشانی تھے۔

ہوائیں اب گرم ہونے لگی تھیں۔ چٹانوں کے درزوں سے پانی رس رس کر برساتی نالے کو بھرنے لگا تھا اور کناروں پر دریائی درخت پر شیریں ننھے ننھے دانے اگنے لگے تھے ننھی ننھی چڑیاں کھلے نیلے آسمان کے نیچے پرواز کرتے ہوئے چہچہانے لگی تھیں جڑی بوٹیوں والے پہاڑوں کا رخ کرنے لگے تھے۔ اور بکریوں کے جسم فربہ ہونے لگے تھے۔

تاج بی بی جب گھر پہنچی تو جاناں خاں روپوں کے ڈھیر کو آگے رکھے سحر زدہ سا بیٹھا تھا اس کی ماں کا صدیوں کی غربت اور بے چارگی سے مرجھایا چہرہ روشن تھا۔ اجنبی آدمی کا گھوڑا چٹان کی اوٹ میں کھڑا تھا اور اس کی لمبی نال والی سیاہ بندوق اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔

وہ اندر چلی گئی کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ______ اجنبی کی آنکھوں سے خائف ہو کر ______ ماں اور باپ کے مسکراتے چہروں کا

مفہوم سمجھنے کی کوشش میں ماں اندر آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''تاج بی بی تیرے نصیب جگ اٹھے ہیں ____ تو سردار چنگیز خاں کے دل پر راج کرے گی میں تیرے لیے خوبصورت پھولوں والے کپڑے بناؤں گی تیرے پاؤں کے لیے جوتی خریدوں گی اور تجھے بہت زیور بنا کر دوں گی ''اس کی ماں نہ جانے خود خواب دیکھ رہی تھی یا اسے دکھا رہی تھی ____ اس کا دل چاہا کہ کہے۔ ''ماں یہ سب کچھ تو میر بخش کے روپے بھی خرید سکتے تھے۔'' لیکن اسے بابا سے ڈر لگتا تھا ____ بابا جو اڑتے پرندوں کا شکار کرتا تھا اور بھیڑ کی کھال کو ایک جھٹکے میں اس کے جسم سے اتار پھینکتا تھا۔ وہ اس کی کھال بھی ادھیڑ سکتا تھا ____ وہ روپے کی اہمیت کو جانتی بھی کب تھی اس نے آج تک ایک پیسے کو بھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوا تھا اور وہ جو کچھ دیر پہلے چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے گا رہی تھی۔

''اے میرے محبوب تو چاند کی طرح پہاڑوں کی اوٹ سے نکلتا ہے تو میرے دل کا تمام اندھیرا دور ہو جاتا ہے تو سرداروں کا سردار ہے اور تری چمکدار سیاہ بندوق کی گولی آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔'' وہ ایک

دم تاریکی میں کھڑی رہ گئی۔ ایسی تاریکی جس میں سب راہیں اور گیت دم توڑ گئے تھے۔

ماں اب اکثر بابا کے ساتھ دور کے قصبے سے سودا لانے چلی جاتی اور وہ چٹان پر بیٹھی قدموں کی چاپ کی منتظر اکیلی بیٹی رہتی گرم ہوائیں برساتی نالے پر ننھی ننھی لہریں پیدا کرتیں خودرو پھولوں خوشبو سے بوجھل اس کے گرد چکر لگاتیں۔ لیکن وہ سر جھکائے کچھ سوچنے کی کوشش کرتی جو کبھی پورا کا پورا اس کے ذہن میں نہ سماتا۔ قالین بنتے چادری پر پھول کاڑھتے یا پشک پر شیشے ٹانکتے ہوئے اس کا جود آنسوؤں سے امنڈ آتا لیکن وہ رہ نہیں سکتی تھی ______ کیا فائدہ ______ وہ جانتی تھی پتہ نہیں اس کا دل عورت کی ازلی بے چارگی کو کیسے خود بخود جان گیا تھا۔

اب ہوائیں اور زیادہ گرم ہو گئی تھیں شاید میر بخش آتا ہو۔'' وہ سوچتی اب وہ بکریاں چرانے نہیں جاتی تھی ماں کو وہ ایک دم بہت قیمتی لگنے لگی تھی۔ اور سردار نے بھی یہی حکم دیا تھا۔ وہ گھر سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

جب سردار چنگیز خان کے گھر سے اناج سے لدے گھوڑے اور فربہ

دنبے اس کے گھر کے سامنے آ کر رکے تو اس نے خشک آنکھوں سے دور چٹانوں کی طرف سے آنے والی راہ کو دیکھا اور اپنے سے اس کے خیال کو نکالنے کا ارادہ کر کے اندر چلی گئی۔لیکن جب بھی وہ سردار کا تصور کرتی تو صرف میر بخش ہی نظر آتا میر بخش جو نہ جانے کون سی راہوں میں کھو گیا تھا۔

ڈھول کی تھاپ پر گھیر دار شلو کے پہنے اور بڑی بڑی پگڑیاں باندھے سرخ چہروں اور روشن آنکھوں والے نوجوان رشتہ دار مرد اپنی بڑی بڑی شلواروں کو تھامے رقص کر رہے تھے۔ان کی بندوقیں آسمان کی طرف ہوائی فائر کرتی رہتیں اندر عورتیں اس کے جسم کو خوشبودار ابٹن سے سنوارتیں اور وداع کے گیت گاتیں وہ اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔وہ سردار کی بیوی بننے جا رہی تھی سردار جس کی بلند حویلی کے اندر کوئی غیر جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔وہ سوچتی شاید وہاں بھی چٹانیں ہوں اور ان پر بکریاں چرتی ہوں کھلی ہوئیں سنسناتی چٹانوں کی درزوں سے گزرتی ہوں اور برساتی نالے کے کنارے خودرو خوشبو والے پھول اگتے ہوں اور اور پھر اس کی سوچ الجھ جاتی سردار ڈھول کی تیز تھاپ پر ناچتے جوانوں کے ساتھ اسے اپنی حویلی

میں لے گیا حویلی جو بلند دیواروں والی تھی جہاں بکریوں کی آوازیں جھرنوں کا شور اور کھلی سرسراتی ہواؤں کی آوازیں نہیں آتی تھیں ــــــــ اس نے خوفزدہ نظروں سے بند حجرے کو دیکھا ــــــــ بند حجرہ جس کا بڑا دروازہ اس کے قد سے بڑا تھا۔

سردار نے اپنے سرہانے گولیوں سے بھرا ہوا پستول رکھتے ہوئے کہا۔

"تاج بی بی اس پستول کی خاموشی تمہاری پاکیزگی کی گواہ ہوگی مجھے اس سے پہلے صرف ایک بار اس کو چلانے کی ضرورت پڑی تھی۔ اور میرا نشانہ بڑا پختہ ہے کیونکہ میں نے کبھی کسی کی تھالی کا بچا نہیں کھایا میں جانتا ہوں میر بخش تمہارا امنگیتر تھا۔ لیکن وہ تمہاری قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا میرے پاس تمہارے لیے بہت کچھ ہے میں نے اپنی پہلی شادیوں پر اتنا ولور کبھی ادا نہیں کیا۔ حالانکہ وہ بھی خوبصورت تھیں اور ہاں میر بخش کو میں نے کبھی اپنی حویلی کے پاس بھی دیکھا تو میرے نشانچی اپنی گولی کبھی خطا نہیں کرتے اور میرے کتے انسانی گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔" سردار کی بڑی بڑی

سرخ آنکھیں اسے گھورتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔

تاج بی بی ہمیشہ کی طرح خاموش رہی اسے بولنا ہی کب آتا تھا صدیوں کی خاموشی کو توڑنا وہ جانتی ہی نہیں تھی ____ رات گزر گئی تھی اور سردار نے غبری کچھ کہے پستول کو اٹھا لیا تھا ____ لیکن وہ جب بھی اکیلی ہوتی اور اس کی خادمائیں گھر کے کاموں میں الجھی ہوئی ہوتیں تو میر بخش کا ہیولہ اس کے سامنے ایستادہ ہو جاتا ____ وہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھتی ____ وہ گناہ کی سزا جانتی تھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی ____ آئینوں سے مزین پشک پہنے وہ آئینے کے اندر جھانکتی تو حیران رہ جاتی ____ یہ وہ تو نہیں تھی ____ پیوند لگے کپڑے اور ننگے پاؤں والی لڑکی جو سردی گرمی چٹانوں پر چھلانگیں لگایا کرتی تھی ____ وہ ایک دم پیچھے ہٹ جاتی کیونکہ اس کا چہرہ ایک اور چہرے میں ڈھل جاتا اور اسے لگتا جیسے حویلی سے پرے کوئی اسے پکار رہا ہو ____ تاج بی بی ہو ____ او ____ او ____ شاید یہ ماں ہے شاید ____ نہیں ____ نہیں ____ وہ دل

ہی دل میں احتجاج کرتی اور جلدی سے چادری کو سامنے بچھا کر کاڑھنے لگتی لیکن اس کا تروپہ ٹیڑھا پڑتا۔اور وہ اسے ادھیڑنے لگ جاتی۔

اس کی ماں بہت بیماری ہوگئی تھی اور اس کا بابا اسے لینے آیا تھا وہ مہینوں بعد ان راہوں پر جارہی تھی جو اس کی زندگی سے ایک دم کاٹ دی گئی تھیں گھوڑے کی لگا پکڑے اس کا بابا آگے چلتے ہوئے اس سے باتیں کررہا تھا۔اس سے بہت سی باتیں پوچھ رہا تھا۔

''سردار کیسا سلوک کرتا ہے کتنے کپڑے بنا کر دیئے اس نے کیا خان نے جوتی بنا کردی ہے یا نہیں اور یہ کہ اس نے خود کتنے روپے جوڑے ہیں ______ ''جاناں خاں کو روپے کی سخت ضرورت تھی اس نے نئی بندوق اور کاشت کی زمین خریدی تھی۔اور اس کی ماں بہت بیمار تھی وہ امیر تھی اور اس کا باپ غریب جو جواب دیتی جارہی تھی ______ اس کی نگاہیں چٹانوں پر بھٹک رہی تھیں۔اور پھر اس نے میر بخش کو ایک چٹان کے پیچھے چھپے ہوئے دیکھا ______ اس کا چہرہ سنولایا ہوا اور لاغر تھا۔

تاج بی بی کا دل زور سے دھڑکا اور اس کا تمام وجود سرد ہوگیا۔

جاناں خاں نے باتوں میں بتایا کہ "میر بخش نے نئی بندوق خریدی ہے اور تمہاری ماں کو تمہارا بڑا فکر ہے ______ نہ جانے کیا ہو۔"

وہ بے بسی سے مسکرائی "نہیں بابا میر بخش ایسا نہیں کر سکتا وہ ایسا نہیں کرے گا وہ مجھے برباد نہیں کرے گا حالانکہ اسے آباد ہونے کا پورا مفہوم بھی نہیں آتا تھا۔

"وہ ایسا ضرور کرے گا ______ انتقام لینا تو اس کا فرض بنتا ہے وہ اتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا تھا" ______ وہ مہینوں سے پہاڑوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔"

"بابا تم چاہتے ہو کہ وہ انتقام لے؟ وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی" تم چاہتے ہو کہ میرا شوہر مارا جائے اور میں پھر تمہارے پاس واپس آ جاؤں تا کہ تم مجھے میر بخش کے سپرد کر سکو ______ دوبارہ میری قیمت وصول کر سکو ______ "اس کی آواز میں رنج تھا۔

جاناں خاں زور سے ہنسا ______ "تاج بی بی تم بہت ہوشیار ہو گئی ہو ______ اور سمجھدار لڑکی مردوں کو بہت پسند آتی ہے ویسے بھی وہ

تمہارا منگیتر تھا اور میرے چاہنے سے کیا ہوگا میں جانتا ہوں سردار طاقتور ہے اپنی اور تمہاری حفاظت خوب کرے گا ______ اور اس یک بندوق کی گولی صرف چٹان کو چاٹ کر پلٹ آئے گی۔‘‘

اس کی ماں رو رہی تھی وہ فکر مند تھی ’’میر بخش مہینوں سے بندوق لیے پہاڑوں میں گھوم رہا ہے پتہ نہیں وہ تمہارا منتظر ہے یا سردار چنگیز خاں کا ______ وہ گھر بھی نہیں جاتا ماں کو بھی نہیں ملتا۔ اس نے سب سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔‘‘

’’میں اس سے ملوں گی اسے سمجھاؤں گی‘‘ تاج بی بی نے فیصلہ کیا اور نیچے اترنے لگی ’’مت جاؤ تاج بی بی وہ تجھے مار ڈالے گا ______ ‘‘ماں چلائی لیکن تاج بی بی اس طرح نیچے اترنے لگی جیسے ہارا ہوا شخص جاتا ہے وہ یادوں کے ریگستان میں خشک لب لیے وہاں اکیلی ہی کھڑی تھی کہ میر بخش ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اب ان دونوں کے درمیان ناقابل عبور فاصلہ تھا۔

’’اچھی تو ہو تاج بی بی ______ ‘‘میر بخش کی ویران آنکھیں

اسے بے بسی سے دیکھ رہی تھیں وہ سر جھکا کر رونے لگی۔

''تاج بی بی چالیس ہزار بہت ہوتا ہے اتنا کہ اگر مجھے دوسری زندگی بھی مل جاتی تو میں اکٹھا نہ کر سکتا میں تم کو بھی الزام نہیں دیتا کہ تم نے اپنا آپ ایک غیر کے حوالے کیوں کر دیا۔لیکن افسوس یہ ہے کہ میں جی رہا ہوں تم جی رہی ہو اور سردار بھی جی رہا ہے____بس مجھے یہی دکھ ہے۔''

''ہاں میر بخش میں جی رہی ہوں____میں ی جینا چاہتی ہوں____مجھے مت مارو میں اس حویلی کے اندر قید ہوں بہت سی دوسری عورتوں کی طرح____اگر میں مر گئی تو بابا کو سردار کا روپیہ واپس دینا پڑے گا اور وہ پھر غریب ہو جائے گا____میں تو کچھ بھی نہیں ہوں____بس بکنے والی چیز ہوں____تم چاہتے تو تم خرید لیتے____''میر بخش بڑھ کر پہلی بار اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تاج بی بی نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھا وہ گھر سے بہت دور چٹانوں کے درمیان کھڑے تھے اتنی دور کہاس کی آواز بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔لیکن میری بخش کے جسم

کے لمس نے اس کے وجود کو جگا دیا تھا۔نہیں...... نہیں وہ چلانا چاہتی تھی لیکن یہ انکار اس کے ذہن کے تاریک گوشے میں چکر لگا رہا تھا______باہر نکلنے کے لیے بے چین لیکن پھر بھی منکر وہ اپنی حالت کا پورا شعور بھی نہیں رکھتی تھی۔

میر بخش نے کہا" تاج بی بی میری محبت میں صرف تم ہی شامل نہیں تھیں تمہارا یہ خوبصورت وجود بھی شامل تھا میں نے مدتوں اس کے سارے میں سوچا تھا۔ایسے چھونے کی تمنا کی تھی اور تم خوب جانتی ہو اپنی منگیتر کو کسی غیر کے حوالے کرنا آسان نہیں۔اور آج میں اپنے حق کو وصول کر کے رہوں گا______چاہے تم چیخو یا چلاؤ یا روؤ______تاج بی بی جس سب لوگ تمہیں کالی کہیں گے تو پھر میں تم کو یاد آیا کروں گا______سردار سے میرا انتقام پورا ہو جائے گا وہ سردار ہے اور میں ایک عام آدمی لیکن دیکھو میں اس کی عزت کو کالا کر رہا ہوں"۔وہ زور سے ہنسا۔

"وہ تجھے مار ڈالے گا،تاج بی بی کی آواز اس کے اندر ہی گھٹ گئی تھی۔

”میں بھی تجھے مار ڈالنا چاہتا تھا ____ اور میں خود بھی زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔تمہارے بغیر میرا سانس بھی مشکل سے نکلتا ہے میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو مرنے سے روکا ہے۔“

اس نے مسکرانا چاہا لیکن اس کی سوچوں پر گہری دھند چھا گئی۔جس کی گہرائی میں سوچ کی ساری کرنیں ڈوب گئیں۔وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔اس کا ذہن ایک ٹھنڈے یخ احساس میں بدل گیا تھا۔

پھر وہ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے الگ الگ راہوں پر مڑ گئے ____ گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر اس نے نیچے وادی کو دیکھا شفق گوں فضا آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی تھی اور سورج کسی بڑی سی سیاہ چٹان کے پیچھے چھپ رہا تھا بکریوں کی آوازوں میں اکا دکا اڑتے پرندے کی آواز بھی شامل تھی۔شاید یہ میری زندگی کی آخری شام ہو یکا یک اس کے اندر زندہ رہنے کی زبردست خواہش جاگی وہ بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن کہاں ____ وہ اٹھ کھڑی ہوئی ____ لیکن سب طرف پتھر ہی پتھر تھے۔

راہیں کدھر کو مڑتی ہیں وہ نہیں جانتی تھی ______ میری بخش اونچی چٹان کے دوسری طرف اترنے سے پہلے آخری بار اس گھر کو دیکھا جہاں کبھی اس کی ساری کائنات سمٹی ہوئی تھی ______ لیکن اب وہ وہاں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی اس کے بغیر......

یہ کیا ہو گیا ______ میں نے کیا کیا ______ میر بخش نے سوچنے کی کوشش کی ______ وہ یہ انہیں چاہتا تھا لکین اس کے اندر کے انتقام نے ایک تباہ کن رخ اختیار کر لیا تھا اور وہ اس کے لیے خود کو بھی معاف نہیں کر سکتا تھا وہ اب پھر انہی چٹانوں کے درمیان گھوم رہا تھا جہاں پچھلے چھ ماں سے وہ آوارہ جھونکے کی طرح بھٹکتا پھرا تھا ______ وہ میری منگیتر تھی ______ وہ تاج بی بی تھی......وہ......وہ......اس نے اپنی بندوق کا رخ نیچے کو کر لیا اور سردار کی حویلی کو چل پڑا فتح کی ساری خوشی بھربھری مٹی کی طرح اس کی زبان پر اتر آئی تھی ______ اور گزرے دکھ کی ساری چبھن اس کی آنکھوں میں آنسو بن گئی تھی ______ چاہت کے زہر نے اسے جنونی بنا ڈالا تھا۔

اگلے روز سردار چنگیز خاں کی حویلی کی ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس نے چٹانوں پر ایستادہ سورج کو دیکھا اور سردار کے آدمی کے پیچھے چلتا اندر داخل ہو گیا۔

''سردار تم نے میری منگیتر چھین کر میری غیرت کو للکارا تھا۔ اور آج میں نے تمھاری عزت کو داغدار کیا ہے، اور اب میں سزا کے لیے تیار ہوں''

اور یہ کہتے ہوئے ہی اُسے لگا جیسے اتنے مہینوں کی مسافت طے کرتے ہوئے وہ نڈھال ہو چکا ہے۔ اور کہیں نرم دوب پر لیٹ کر سونا چاہتا ہے

سردار چنگیز خاں نے پاس پڑی بندوق اٹھائی اور بولا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہاری یہ ہمت نہیں ہو سکتی______''

''نہیں، میں جھوٹ نہیں کہتا۔ مجھے اپنے باپ کی سفید داڑھی کی قسم۔ میں نے کل اسے کالا کیا ہے...... وہ چٹان بھی اس بات کی گواہی دے سکتی ہے۔ اور تم تاج بی بی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ جاؤ، دیکھو وہ آج بھی برہنہ سَر اپنے باپ کی دہلیز پر بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کی راکھ ہے اور آنکھوں میں آنسو...... میں اِس لیے آیا ہوں کہ تمہیں بتا سکوں

________ "تمہاری داڑھی کی لمبائی کو کم کرسکوں ________ تمہیں بے عزت کر کے مجھے بڑا سکون ملا ہے......" اس لیے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا، سردار نے بندوق سیدھی اس کی طرف تان دی۔

وہ بڑا اپکا نشانہ باز تھا۔

تاج بی بی بار بار اُٹھتی اور بیٹھ جاتی ________ رضیہ اور جاناں کسی اَن ہونی کے منتظر اندر بیٹھے تھے۔ لیکن تاج بی بی نے کل سے ایک بات بھی نہ کی تھی۔ پتہ نہیں وہ خوش تھی یا غمزدہ، بس ٹھراؤ کا ایک لمحہ اُس کے چہرے پر ثبت ہو گیا تھا ________ اور جب دو چٹانوں پر گھوڑے کے تیز ٹاپوں کی آواز گونجی تو وہ چونک کر کھڑی ہو گئی ________ اس واقعے کی تمام سچائی اس پر عیاں ہو گئی۔

"میں کالی ہو گئی...... میں کالی ہو گئی۔" وہ زیرِ لب بڑ بڑائی...... "میر بخش نے مجھ سے انتقام لیا ہے ________ اور اب سردار چنگیز...... اُس نے سامنے پھیلی وادی کے پتھروں کو حسرت سے دیکھا ________ کوئی اور راہ ہے ________ کوئی راہ جس پر میں جا سکوں

لیکن کہاں ......اس کا معصوم ذہن خوف کے مارے دوبارہ سن ہو گیا۔وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

سردار نے اس کے باپ کو زور زور سے پکارا________اس کی آواز میں کچھ تھا جس نے تاج بی بی کو بتا دیا تھا کہ میر بخش نہیں رہا۔میر بخش نہیں رہا اور چٹانیں بیوہ ہو گئیں______میں بیوہ ہو گئی۔اُس نے پاس پڑے پتھر پر اپنی کانچ سے بھری چوڑیوں والی کلائی زور سے دے ماری ......چھن چھن ......ٹکڑے ہی ٹکڑے۔اس کے معصوم جذبات کے ______اس کی بے ضرر تمناؤں کے ......سب طرف بکھر گئے۔سردار کے چہرے کا خوف موت کے خوف سے بڑھ کر اسے اندر ہی اندر ڈبونے لگا۔اس کا جی چاہا۔وہ بھاگتی ہوئی اندر جا کر ماں کی پشت میں چھپ جائے۔اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور اس کی ہتھیلیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔وہ بے خبری میں رو رہی تھی اس کا دل غم کے کسی واضح جذبے کو نہیں سمجھ رہا تھا،بس وہ ایک گہرے اور دبیز خوف میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جب اس کا باپ واپس آیا تو اس کی پگڑی گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس کی نئی خریدی ہوئی بندوق کا رُخ زمین کی طرف تھا۔ وہ چپ چاپ اندر آ گیا۔

''تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے سب کچھ مٹا دیا تاج بی بی۔'' اس کی ماں روتی ہوئی آ کر اس سے چمٹ گئی۔

وہ کیا کہتی ...... کچھ تھا جو بہت ڈراؤنا تھا۔ جس سے ڈر کر اس کے ماں باپ رو رہے تھے۔ دور چٹان کے پاس سردار کھڑا تھا۔ وہ جو اس کے لیے رنگین کپڑے اور زیور لے کر آیا تھا۔ جس نے اس کے حسن کی تعریف کی تھی۔ لیکن اتنے ماہ کے بعد بھی وہ اس کو اپنا نہ لگا تھا۔ اس نے اپنی رنگین پوشاک کو دیکھا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

سردار کے گھوڑے کی ٹاپیں اس کے سامنے آ کر رُک گئیں۔ اس نے بندوق کی نالی اس کے سینے سے لگاتے ہوئی کہا:

''کیا تم میر بخش کے لگائے ہوئی الزام کو قبول کرتی ہو'' سردار کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں، اور ان انگاروں میں میر بخش کا

مردہ جسم تیر رہا تھا۔

الزام ______ الزام ______ کیا اپنے باپ کو مٹا دینا الزام ہے۔ کیا مِل کر کِیا گیا گناہ گناہ ہوتا ہے ...... کیا میں جینا چاہتی ہوں، میر بخش کے بغیر ...... میر بخش، جو اس کا بچپن کا منگیتر تھا ______ اس نے اقرار میں سَر ہلا دیا ______ سردار کی بندوق اس کر چبھ رہی تھی اور وہ اب بھی سَر جھکائے بیٹھی تھی ...... سردار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا۔ لیکن پھر وہ زور سے چلاّ اُٹھا۔ اور اس نے سوچا اس کے وجود میں تیز آگ کی طرح کی گولی ...... اور پھر سارا دکھ مٹ جائے گا۔

لیکن سردار چلایا۔ جاناں خاں اور رضیہ بی بی، تم لوگ چلے جاؤ یہاں سے ...... لت جاؤ جو لے کر جانا ہے۔ میں اسے اپنی مرضی کی موت ماروں گا۔ ایسی موت کہ پھر کسی بیوی کو شوہر سے بے وفائی کا حوصلہ نہ ہو ______ " سردار کو اس کے چہرے کے ٹھہراؤ نے ایک دم مشتعل کر دیا تھا۔

جاناں خاں اور رضیہ بی بی جانتے تھے، ہونی ہو کر رہے گی۔ اسے اب کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ پھر تاج بی بی کے جینے اک کیا فائدہ ــــــ وہ سیاہ داغ کو لے کر کب تک زندہ رہے گی۔ وہ جو کالی ہے ــــــ مر ہی جائے تا بہتر ہے۔'' انہوں نے رکتے ہوئے کہا...... ان کی بیٹی اور کالی...... کالی ــــــ ان کا دماغ گونج رہا تھا۔

''خان' ہمیں اس برساتی نالے کے پار جانے دینا۔ پھر تمہاری مرضی...... بس اتنا انتظار کرنا......'' اور دونوں بھاگنے لگے...... نالہ دور تھا اور وہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ نالے تک پہنچتے تاج بی بی کی دردناک چیخ ان کے پیچھے تیزی سے لپکی۔ اور پھر ان کو ایسا لگا جیسے اوپر نیچے آگے پیچھے صرف چیخیں ہی چیخیں ہوں۔ کلہاڑی سے کٹتی اس معصوم کی چیخیں جو کچھ دیر بعد ہمیشہ کے لیے خاک ہو جائے گا...... چیخیں جو خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس سرخ خون میں جو تاج بی بی کے چہرے کی ضیا، اس کے بالوں کی سیاہی اور آنکھوں کی چمک تھا۔

پھر آہستہ آہستہ تمام آوازیں تھم گئیں یا شاید انہوں نے سننا چھوڑ دیا تھا۔ سناٹے کا خوفناک احساس ان کی رگوں کو منجمد کرنے لگا۔ دھندلی آنکھوں سے انہوں نے چنگیز خان کو خون آلود کلہاڑی سمیت دور تک ایک چٹان کے پیچھے مُڑتے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ جاناں خاں پوری طرح ہوش میں آتا رضیہ بی بی نے نیچے چھلانگ لگا دی تھی مرنے کے لیے جاناں خاں جب اسے ہسپتال سے لے کر گھر پہنچا تو وہ نیم جان میں تھی، اور پھر ڈاکٹر یوسف نے اس کا علاج کیا تھا اور جاناں خاں کو دفتر میں لگوایا تھا۔

رضیہ بی بی روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہ ظالم اسے بندوق کی گولی سے بھی مار سکتا تھا، لیکن اس نے اس کے نازک جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اماں اس کی چیخیں آج تک میری سماعت سے کبھی جدا نہیں ہوئیں۔ وہ مجھے پکارتی رہتی ہے...... لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ میری روشن چہرے والی چڑیا۔“

جاناں خاں نے نوٹوں کی ایک پوٹلی کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”

بیگم صاحب ،لگتا ہے اگر مَیں نے ان روپوں کر ہاتھ لگایا تو میرا ہاتھ خون سے بھر جائے گا۔اس کے خون سے۔''

میں نے دیکھا نوٹوں کے کنارے بوسیدہ ہو چکے تھے۔وَلوَر وسشیزہ کی قیمت۔دلوں اور جذبوں کی رنگین قوسِ قزح کی قیمت۔پتہ نہیں تاج بی بی اس وقت کیا سوچ رہی ہوگی۔آنے والی موت کے بارے میں یا میر بخش کے بارے میں......یا صرف اس کلہاڑی کے بارے میں جو اس کے جسم کو کاٹ رہی تھی۔میں جانتی ہوں رضیہ بی بی سوچ نہیں سکتی ،صرف آنسو بہا سکتی ہے......گھل سکتی ہے۔

ایک سال کے اندر ہی رجیہ بی بی کا جسم لاغر اور زرد ہو گیا تھا۔شاید اسے تپ دق ہو گئی تھی......میں نے اس سے کام لینا چھوڑ دیا تھا۔وہ اپنے کوارٹر میں پڑی کھانستی رہتی۔جاناں خاں اس سے الجھتا رہتا اور پھر وہ ایک دن خاموشی سے مر گئی۔

میں دونوں ہی سنجیدہ رہی۔مجھے اکثر تصور میں اس کی آنکھیں نظر آتیں۔آنسوؤں سے تر۔

کچھ مہینوں بعد جاناں خاں نے شادی کر لی۔اس کی بیوی خوبصورت چہرے اور غزالی آنکھوں والی چھوٹی سی معصوم لڑکی تھی۔

اس نے کہا۔"بیگم صاحب، میں نے پورا تیس ہزار روپیہ ادا کیا ہے۔وہ بے حد خوش تھا۔اس کے ادھیڑ چہرے پر جذبات کی نئی لَو روشن تھی

میں نے اس کی دلہن کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو خان، اس کو کبھی میکے نہ بھیجنا۔" میں نہیں جانتی میں نے یہ الفاظ اس وقت کیوں ادا کیے تھے۔شاید میرے لاشعور میں ابھی تک تاج بی بی کی چیخیں اٹکی ہوئی تھیں۔

"جی بیگم صاحب۔" اس نے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔اور واپس چلے گئے۔

میں برآمدے میں بیٹھی سامنے پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔بہار کی آمد چٹانوں سے سبزہ پھوٹ رہا تھا۔لان کی سوکھی گھاس میں ہریاول کی ننھی ننھی شاخیں ابھر رہی تھیں۔اور پھولوں کی شاخوں سے معصوم سرخ پتے جھانک رہے تھے۔بالکل جاناں خاں کی نئی دلہن کی طرح کے خوبصورت پتے۔

کچھ دنوں بعد بہار آئے گی۔ لان پھولوں سے بھر جائے گا۔ پھول اور چہرے۔ بہار اور دوشیزگی _______ لیکن دور کوئی صدا گونج رہی تھی ۔شاید کوئی اسے پکار رہا ہے ۔تاج بی بی _______ شاید رضیہ بی _______ اَو _______ اَو _______ ہو بی کی آواز ہو یا میر بخش کی ۔تاج بی بی _______ خودرو پھول۔ لیکن آج بھی میرے تصور میں رضیہ کی گیلی اور سُلگتی ہوئی آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں اور پھر وہ روتے ہوئے کہتی ہے _______ ''بی بی وہ کالی ہو گئی تھی......وہ جو میری اکلوتی بیٹی تھی۔''

جینے کی راہ

ٹیلی فون ایکسچینج کی نئی عمارت بَن رہی تھی۔ عورتوں اور مردوں کا جمِ غفیر سَروں پر ٹوکریاں اٹھائے ایک دوسرے کے پیچھے چپ چاپ چلتے ہوئے جا رہے ہیں...... مسالہ ملانے والی مشین کی آواز...... کام کی نگرانی کرنے والوں کی آوازیں اور باہر سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کے تیز ہارن مل کر بھی اس خاموشی کو نہیں توڑ سکتے جو مزدوروں کے چہروں پر گہری کھدی ہوئی ہے...... وہ مسکرانا ہی نہیں جانتے شاید...... جیسے قسمت کے مظبوط ہاتھوں نے انہیں اَن دیکھی رسی سے باندھ رکھا ہے اور انہیں مسلسل حرکت

دے رہے ہوں۔

میں باہر کی چاردیواری کے پاس بنے کیبن میں بیٹھا لگاتار سگریٹ پھونکتا رہتا ہوں یا جوان اُدھیڑ مزدور عورتوں کو خاموشی سے گھورتا رہتا ہوں۔ان کے رنگین کپڑے جب پسینہ سے شرابور ہو کر سڈول جسموں سے چپک جاتے ہیں تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔میں سلطانہ کے جسم کے زاویوں کو دیکھتا ہوں تو میرا سارا جسم عجیب لذت بھری خواہش سے اینٹھنے لگتا ہے......تب دوسری ساری آوازیں صرف ایک آواز میں ڈھل جاتی ہیں۔سلطانہ کے کرتے کے دامن سے بندھے چھوٹے چھوٹے گھنگرو اور اس کے چٹلے سے بندھی ہوئی ننھی ننھی چاندی کی گھنٹیاں۔اس کے ہر اٹھتے قدم کے ساتھ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے سلطانہ ہولے ہولے سسکاریاں بھر رہی ہو......اپنی قسمت کا ماتم کر رہی ہو......اس کا خوبصورت سانولا چہرہ گہری سرخی سے تپ جاتا ہے۔اس کے قدم سست پڑ رہے ہیں تو اس کا شوہر اسے ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے۔

”کیا مات پڑ گئی ہے جو تو یوں چلے ہے۔بھگ بھگ۔نہیں تو یوں

جوتیاں ماروں گا کہ یاد ہی کرے گی۔"

سلطانہ کا چہرہ ایک دَم راکھ ہو جاتا ہے......اس کے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔ ننھے گھنگرو چھنکتے ہیں اور میرا جی چاہتا ہے میں آگے بڑھ کر اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لوں لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا......اس کے شوہر کا مظبوط جسم اور اعتماد سے پُر چہرہ ایک خوف بن کر میرے اندر سما جاتا ہے......میں سوچتا ہوں میں کسی نہ کسی روز سلطانہ کر لے کر اس دھوپ بھری دوپہروں اور اس کے شوہر کے قہر بھرے چہرے سے دور لے جاؤں گا۔تب اس کا جوان خوبصورت وجود زیادہ اُجلا ہو جائے گا......میرا تصور نہ جانے کہاں بھٹکنے لگتا ہے......میں سوچتا ہوں مجھے سلطانہ سے محبت ہے لیکن میں اس سے محبت نہیں کرتا......بس خوف اور خواہش کے درمیان معلق میں تیزی سے سگریٹ کے کش کھینچتے ہوئے اک پھڑکتا سا عاشقانہ پنجابی گیت گنگنانے لگتا ہوں......ایسا لگتا ہے جس میں جسم کا ذکر ہے۔جوانی کا ذکر ہے......اور یہ جسم سلطانہ کا جسم ہے......یہ جسم میرا جسم ہے۔

میرا انہماک چھوٹے سے بچے کی بھوک سے بلبلاتی چیخ سے ٹوٹتا

ہے۔ خدا کی ناانصافیوں پر پہلا احتجاج۔

دوسری مزدور عورت رضیہ میرے کیبن کے پاس آ کر رُکتی ہے۔ اس کا کُرتا بہتے دودھ سے بھیگا ہوا ہے...... اس کے کانوں کی بالیاں اور ناک کی لونگ پسینے اور گرد سے میلی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر مامتا کی لپک نے اسے جاندار مجسمے میں ڈھال لیا ہے...... مَیں گانا بند کر دیتا ہوں اور سوچتا ہوں ...... یہ بھیگا ہوا جسم بھی عورت کا ہے...... لیکن میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا...... اور منہ پھیر کر بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا ذہن عورت کے اس رُوپ کو قبول نہیں کرتا...... عورت تو صرف عورت ہے جس کے جسم کے زاویے مَرد کو مدہوش کر دیتے ہیں ...... اس کے اندر کا شیطان پوری طرح چوکس ہو جاتا ہے...... میں رضیہ کو دیکھ کر مسکراتا ہوں۔ لیکن وہ اپنے بچے پر جُھکی اسے چوم رہی ہے...... اور پھر اُسے میلے کپڑے پر لٹا کر واپس چلی جاتی ہے...... اور مجھے لگتا ہے جیسے اس نے مجھے دھتکار دیا ہو...... میرے اندر کا مرد تلملانے لگتا ہے...... بااختیار اور خود پسند مرد۔

سورج آسمان پر سفر کرتا ہوا مغرب کی طرف جھک گیا ہے

......نگرانی کرتے کارندے...... تھکن سے نڈھال عورتیں...... گٹھے ہوئے جسموں والے جوان مرد میرے کیبن کے سامنے اکٹھے ہو رہے ہیں

____ گرد آلود ہوا بجری کے ڈھیروں اور بکھری ہوئی ریت پر آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے......اُوڈ عورتوں کے بدبودار کپڑوں میں سے گزرتی ہوئی چاروں طرف گھوم رہی ہے۔سلطانہ نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنا منہ پونچا ہے اور چپ چاپ اپنے شوہر کے پاس کھڑی اپنی مزدوری کی منتظر ہے......ٹھیکیدار اپنی سیاہ ٹیوٹا گاڑی کو تیزی سے اندر لاتے ہوئے ایک دم روکتا ہے اور تیز تیز قدم رکھتا کیبن میں آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے

____ میں رجسٹر میں نام لکھ دیتا ہوں اور بڑھتے ہوئے ہاتھ پر نوٹ رکھتا جاتا ہوں......میں جانتا ہوں سلطانہ کا ہاتھ چاندی کی انگوٹھیوں کا بوجھ سنبھالے آہستہ سے آگے بڑھے گا......اور پھر......لیکن نہیں......میں ایسا نہیں کرسکتا......ٹھیکیدار مسکرا کر اس کا حال پوچھتا ہے......وہ مسکراتی ہے......لیکن خوفزدہ سی اپنے شوہر کو دیکھتی ہے......اور میرا جی چاہتا ہے مَیں ٹھیکیدار کو اُٹھا کر باہر پھینک دوں......لیکن ایسا ممکن نہیں ____ میں جو

سارا دن اس چھوٹے سے کیبن میں پنکھے کے نیچے آرام سے بیٹھا رہتا ہوں
اتنا ہی بے بس ہوں ...... ٹھیکیدار کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا پڑھا لکھا
مزدور ______ میں نے سلطانہ کے ہاتھ پر روپے رکھتے ہوئے اُسے
آہستہ سے چُھوا ہے......اور میرے سارے جسم میں سنسنی سی دَوڑ گئی ہے
......میرا سارا جسم ایک دفعہ پھر خواہش سے تپ گیا ہے......

سڑک کی دوسری طرف چائے کی دکان کے سامنے بچھی بے رنگ
میز کرسیوں پر چند جوان لڑکے بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔اور ننگی نظروں سے
عورتوں کو گھور رہے ہیں ......میں انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔چائے خانے کا
مالک بھولا پہلوان بے داغ بوسکی کی قمیض شلوار پہنے۔بالوں میں خوشبودار
تیل لگائے سگریٹ سے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے ایک
طرف بیٹھا لڑکوں کو ڈانٹ رہا ہے ______ اس کے جوان چہرے پر
سنجیدگی اور ٹھہراؤ ہے۔

''اپنا کام کرو ......چائے کو دیکھو ......غیر عورتوں کو گھورنا ہے تو
آئیدہ یہاں نہ آنا......وہ بھی کسی کی ماں بہنیں ہیں۔سمجھے......اس نے تیزی

سے سگریٹ کی راکھ کو چٹکی بجا کر زمین پر جھٹکا ہے ــــــ لڑکے مسکرا کر چائے پینے لگتے ہیں ــــــ اور پھر چائے کی قیمت کر چکا کر اُٹھ جاتے ہیں......اور اَن منے قدموں سے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے چل پڑتے ہیں ــــــ میں بھی اُن کی طرح عورت کے وجود اور اس کے سحر سے آگاہ ہوں ــــــ اور سلطانہ کا جسم...... ہر چیز خریدی جاسکتی ہے......چائے کی پیالی......سگریٹ کا پیکٹ......عورت کا جسم......اور مَیں یہ بھی جانتا ہوں یہ ساری مزدوری کرتی اُوڈ عورتیں بھی خریدی جاسکتی ہیں......رضیہ کی قیمت پندرہ سو روپیہ تھی......انوراں کے مظبوط بازو اس کے شوہر کر پورے دو ہزار روپے میں پڑے تھے......فیروزاں کے اونچے آگے کو بڑھے دانتوں کی وجہ سے اس کے باپ کو صرف آٹھ سو روپیہ ملا تھا......اور یہ سلطانہ ــــــ اسے نواب نے پورے پانچ ہزار میں خریدا تھا......

نواب نے ایک روز میرے پاس بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پورا پھیلاتے ہوئے کہا تھا ــــــ ”بابو صاحب میں نے سلطانہ کو دن رات کی کمائی جمع کر کے پورے پنگ ہجار میں کھریدا ہے جی.

۔اب میں کیا اسے سر پر بٹھاؤں ......میں نے تو اپنے پیسے پورے کرنے ہی ہیں......مجبوری تو یہ کرے ہی کرے“......اور میں نے نواب کے پاس بیٹھی اس معصوم لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھیں ایک دم بجھ گئیں تھیں اور اس کا خوبصورت چہرہ اُس کے گلابی کڑھے ہوئے کڑتے اور ننھے ننھے گھنگرو دامن کے درمیان ایسے لگا تھا جیسے بجھی سگریٹ دھواں دینے لگی ہو......

میں زور سے ہنسا اور بولا۔”نواب مہنگی چیز کی تو حفاظت کی جاتی ہے۔سنبھال کر رکھا جاتا ہے اور تم نے اپنی اتنی مہنگی جورو کو راکھ مٹی میں ڈال دیا ہے......کیا تمہیں اس سے محبت نہیں۔“

”جی محبت......جی محبت تو مجھے سلطانہ سے ہے۔جی جبھی تو میں نے پورے دس سال کے بعد اسے اس کے باپ کو بڑی منتوں کے بعد شادی پر راجی کیا تھا جی......وہ تو مانتے ہی نہیں تھا۔کہتا تھا میری سلطانہ بڑی کھوبچھورت ہے اس کے تو پورے دس ہجار لوں گا......نواب کا جوان چہرہ جھیلے ہوئے انتظار کے کرب سے سخت ہو گیا......وہ انتظار جو اس نے برسوں روپوں کی گنتی پورے ہونے کے انتظار میں اُٹھایا ہو گا۔اس کا دل لحظہ

لحظہ اس کے انتظار میں بھیگا ہوگا۔اور اب نواب سلطانہ سے اس ساری محبت اور تگ ودَو کی قیمت قصول کر رہا ہے۔کیا یہ محبت تھی یا انسانی فطرت کا تقاضا جب جسم کی سچائی ہی سب سے اونچی پکار بن جاتی ہے۔

نواب نے سگریٹ کو بجھا کر جیب میں رکھا اور میری طرف غور سے دیکھا اور بولا۔

"بابو صاحب تم جانو جندگی بڑی کٹھن ہووے ہے۔روپیہ پیسہ ہی تو طاقت ہے۔ہماری شماری میں عورت تو کام نہ آوے...... پیشا کام آوے پیشا۔اور پھر ہمارے باپ دادوں سے ایسا ہی ہوتا آوے ہے۔قیمت تو چُکانی ہی پڑے ہے......اور کیا مرد کی کوئی قیمت نہ ہووے۔ہووے ہے صاحب......میرے جیسا جوان سلطانہ کو دِکھے ہے کوئی دوسرا۔اس ساری ٹکڑی میں جانچو تو جرا۔کوئی دکھے ہے میرے جیسا جنا۔" وہ بڑے اعتماد سے مسکرایا......"سلطانہ تو اپنے آپ کو بڑی بھاگوان سمجھے ہے۔بڑی گُھش ہے منے سنگ۔کیوں ری تو بھی تو بول۔" اُس نے سلطانہ کی چرف دیکھے ہوئے کہا۔اور سلطانہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔میں جانتا ہوں۔میں جو بڑھیا

سگریٹ پیتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہنتا ہوں۔ نواب کے سامنے اپنے آپ کو حقیر اور چھوٹا محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے سارے جذبے سچے اور کھرے ہیں۔ اور مَیں۔ میرا ہر احساس صرف جھوٹ میں لپٹا ہوا ہے...... میں اپنے اندر کی سچائی کو اپنے سامنے عیاں کرنے سے بھی گھبراتا ہوں۔ میں بھی تو صرف جسم کو پہچانتا ہوں ......لیکن اسے محبت کا رنگ دیتا ہوں

میں نواب سے بڑا دھوکہ باز ہوں

شام کا سورج عمارت کی بلندی کی پچھلی طرف زمین کے بطن میں اُتر رہا ہے۔ چولہوں میں آگ جل رہی ہے۔ دھواں آسمان کی طرف اٹھتا ہے اور پھر تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہ سب یہاں بیٹھے زندگی سے کچھ زیادہ نہیں مانگتے۔ اپنے بازوؤں پر بھروسہ ہی ان کا ایمان ہے۔

شام کے آسمان پر چیلیں طمانیت بھرے پر پھیلائے دائرے میں اڑ رہی ہیں طانیت کہاں ہے پیسے کمانے میں محبت کرنے میں یا محبت کی قیمت چکانے میں میں نے سلطانہ کی طرف دیکھا ہے وہ اپنی ساس کے پاس چپ چاپ بیٹھی اڑاتی چیلوں کو دیکھ رہی ہے اس کا چٹلا ساکت ہے اس کے

دامن کے گھنگرو بھی ساکن ہیں۔اور مجھے لگ رہا ہے جیسے سب کچھ تھم گیا ہو......رک گیا ہو۔

میں جاتے جاتے رک جاتا ہوں کھٹی لسی میں پکائے گئے چاولوں کی ناگوار بو سب طرف پھیلی ہوئی ہے......لیکن میں اس بو کو سونگھے بغیر ایک اور بو کو سونگھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو سلطان کے جسم سے اٹھ رہی ہوگی۔

عورتوں کے رنگین چھینٹ کے کپڑے مٹیالے ہو چکے ہیں لاکھ کے سفید چوڑوں سے بھرے بازو۔ناک میں پڑی ہوئی بڑی بڑی لونگیں گلوں میں لٹکے کنٹھے......ان عورتوں کی ساری زندگی کی بس اتنی ہی تو قیمت ہے لیکن میں سلطان کے لیے اس سے کہیں زیادہ دے سکتا ہوں______میں سلطانہ کا سودا دل ہی دل میں طے کر لیتا ہوں......سونے کے زیورات ......ریشمی کپڑے......اور شائد کسی روز میں یہ سودا کر سکوں......شاید میں کبھی اس کو چھو سکوں......

میں گیٹ سے باہر سڑک کے کنارے بھولا پہلوان کے چائے خانہ پر جا کر بیٹھ جاتا ہوں......شاید میں تھک گیا ہوں...... معلوم نہیں میری تگ و

دو کی کون سی منزل ہے ......کوئی نہیں بتاتا...... ہر ایک کو اپنی راہ خود ہی ڈھونڈنی پڑتی ہے۔

”کیوں بابو صاحب تھک گئے ہو کیا او لے چھوٹے ملائی والی چائے لانا گرم گرم۔“ اور بھولا پہلوان میرے پاس آ کر بیٹھ گیا ہے اس نے سگریٹ کا تیز کش لیتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے...... کچھ کہتا ہو...... کچھ مانگتا ہوا ہاتھ۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔

”بابو صاحب یہ جوان سی چھوکری ہے نا ______ جو نئی نئی آئی ہے مزدوری کرنے ...... کیا نام ہے، سلطانہ ______ ہاں سلطانہ اس نے بڑی گڑبڑ پھیلا دی ہے جی چھوکروں میں۔ میں تو حرامیوں کو بیٹھنے ہی نہ دوں اڈے پر پر کیا کروں دھندا ہی ایسا ہے اس کے گھر والے کو کہیں کہ اسے کھلے عام نہ لیے پھرے نہیں تو کسی دن کسی چھوکرے کے سنگ بھاگ جاوے گی پہلوان کے لہجے میں فکر مندی سی تھی۔ کمبخت غریب ہو کر بھی اتنی نازک لگتی ہے جیسے کانچ کی بنی ہوئی ہو۔ اللہ اپنی کاری گری کہاں ضائع کر دیتا ہے۔ کیا ضرورت تھی اسے ایسا بنانے کی۔“

”لیکن میں نواب کو کیسے کہہ سکتا ہوں۔ میرا اُس کا کوئی ناطہ تو نہیں ہے۔“

”نہیں جی اُونچ نیچ تو سمجھانی پڑتی ہے۔ آپ اُن کے انچارج جو ہوئے۔“ اور میں سوچ رہا ہوں کہ سلطانہ صرف مجھے ہی نظر نہیں آتی۔ دوسرے بھی اُسے دیکھتے ہیں...... دوسرے بھی اُس کی خوبصورتی سے مسحور ہیں۔

میں نے کہا۔ ”پہلوان جی نواب اُس کی قیمت جانتا ہے۔ اُس کی حفاظت کرے گا۔ یہ لوگ بار بار شادی نہیں کر سکتے...... اُن کے پاس بیوی خریدنے کے لیے پیسے کہاں ______

”میں سمجھاؤں گا اُسے۔ خود بھی تو چھوکرا سا ہے۔ اور شہر کی ہوا عورتوں کو بہت جلد بدل دیتی ہے۔ مردوں کی نظریں دلوں میں اُتر جاتی ہیں جی ______ وہ بہت جلد سمجھ جائے گی کہ وہ کتنی خوبصورت ہے۔“ پہلوان کی آنکھوں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور وہ گہرے کش کھینچ رہا تھا۔

مَیں نے پھر کہا ______ ”پہلوان جی لڑکے کے ماں باپ بھی

تو ساتھ ہیں...... وہ کہاں جائے گی......"

"پر بابو صاحب آپ نے کبھی لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا ہے۔ ہر روز مار کھانے والی عورت زیادہ دیر ایسے مرد کے پاس نہیں رہتی......"

"کیا ہے اُس کی آنکھوں میں۔" مَیں تجسّس سے بولا۔

"کچھ تو ہے...... جیسے وہ رو رہی ہوں۔ اور پھر بغاوت بھری ہت جی۔

"پر پہلوان جی آپ نے کیسے پڑھیں اُس کی آنکھیں۔" مَیں ہنس کر بولا۔

بابو جی۔ بازار میں بیٹھنے والا آدمی ہوں...... راہ جاتی عورت کا چال دیکھ کر پہچان جاتا ہوں کہ کس قماش کی عورت ہے۔ چالو ہے یا شریف ہے یا رنڈی"

"پر نواب سے بہتر اُسے کوئی اور کیا ملے گا۔"

"آپ بھولے شاہ ہیں جی۔ عورت جو کچھ چاہتی ہے۔ نواب کے پاس نہیں۔ سختی دِلوں کو پتھر بنا دیتی ہے۔ اور وہ تو کانچ کی بنی ہوئی ہے جی

اور نواب اس کی قیمت کیا جانے۔ اُس کے لیے تو وہ صرف ٹوکری ہے
بوجھ اٹھانے والی۔"

مَیں پہلوان کے ذاتی تجربات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا
ہمارا اُس کا چند ماہ سے ہی ساتھ ہوا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں وہ سڑک پر جا
تی عورتوں کو گھورتا نہیں اور نہ دوسروں کو گھورنے دیتا ہے۔ غیر محسوس طور پر
سب اُس سے ڈرتے ہیں اور اُس کی عزت کرتے ہیں۔

سلطانہ اور مرد _ _ _ _ _ _ سلطانہ اور اس کا شوہر
_____ عورت کی قیمت _____ چند ہزار روپے۔ نقلی زیور
_____ بے باک نظریں _____ شائد ہم سب اس کو بکاؤ مال سمجھتے
ہیں۔ اُسے خریدنا چاہتے ہیں _____ شائد نواب اپنی چیز کی قیمت سے
پوری طرح واقف ہے۔ اُس کی حفاظت کرنا جانتاہ" _____

عمارت بلند ہو رہی ہے _____ اور ساتھ ہی میرے دل میں
سلطانہ کا خیال _____ مَیں اُس کے وجود سے ہر لمحہ آگاہ رہتا ہوں
_____ اِس لیے اُس کے اندر آتی تبدیلیاں بھی مجھے سب سے زیادہ

نظر آتی ہیں ______ میں چاہتا ہوں وہ مجھے دیکھے ______ لیکن میں اکیلا تو نہیں _ _ _ _ _ _ اُس کے سب طرف مرد ہی مرد ہیں ______ ٹھیکیدار، ٹھیکیدار کا جوان بیٹا جواب اکثر وقت بے وقت آنے لگتا ہے۔ کارندے ...... لیکن نواب اُسے کہیں نکلنے نہیں دیتا۔ نواب کی ماں کی نظروں کی چوکیداری سب پر نظر رکھے ہوئے ہے ______ لیکن اب سلطانہ پہلے کی طرح سہمی ہوئی نہیں رہتی۔ سلطانہ کی آنکھیں بولنا سیکھ گئیں ہیں۔ وہ مردوں کو ترچھی نظروں سے دیکھتی ہے۔ ہولے سے مسکراتی ہے اور سیدھی ہو کر ٹوکری کو سر پر اُٹھائے نواب کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اُس کا چھوٹا سا گھونگھٹ اکثر سرک جاتا ہے۔

وہ سب ہمیشہ کی طرح چپ چاپ کام کیے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے جیسے آوازوں کا شور اُٹھ رہا ہو اور ان آوازوں میں سلطانہ کو بولتی آنکھوں کی سب سے بلند آواز ہو۔ اب وہ اپنی مزدوری لینے کے لیے جب ہاتھ آگے بڑھاتی ہے تو ماتھے تک کھینچے ہوئے گھونگھٹ میں آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ نواب اُسے جھڑکتے ہوئے کہتا ہے۔

''تو ہٹے گی یا دوں لات ۔'' میں نے دیکھا ہے کہ نواب بھی اس کے اندر آتی تبدیلی سے آگاہ ہے ۔وہ اسے اب بات بے بات مارنے لگتا ہے ۔اُس کی ساس بھی اُسے پیٹتی رہتی ہے ......سلطانہ کچھ دیر روتی ہے اور پھر آنکھیں پونچھ کر کام میں مصروف ہو جاتی ہے ......اُسکی موجودگی اکثر مزدوروں میں جان سی ڈال دیتی ہے ـــــــــ لوکل مزدور کام کے بعد بڑے اہتمام سے نہاتے ہیں ۔تیل لگا کر بال بناتے ہیں اور آپس میں دور بیٹھے ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں ...... بوڑھے رحیم نے جب اپنے بالوں کو بڑے اہتمام سے خضاب سے رنگا تو سب جوان چھوکروں سے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا ـــــــــ ''کیوں رحیم بابا نئی شادی کرنے لگے ہو ......میں ابھی بھی تم چاروں پر بھاری ہوں......سلطانہ منہ پر پلو رکھے آہستہ آہستہ ہنستی رہی ......اور رحیم بابا اپنی داڑھی اور بالوں پر بار بار ہاتھ پھیرتا اسے دیکھتا رہتا ہے ـــــــــ اب جب نواب بھولا پہلوان کے چائے خانہ پر جاتا ہے تو وہ بھی جا کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔بھولا اُسے بھی ملائی والی چائے پلاتا ہے ـــــــــ اور میں جانتا ہوں ایک نا ایک دن کچھ ایسا ہو

گا جو نواب کے حق میں اچھا نہ ہو گا...... اب نواب اُسے پہلے سے بھی زیادہ مارتا ہے۔ وی بجری پر چادر لے کر لیٹ جاتی ہے اور پھر کبھی کبھار چادر کا کونہ اُٹھا کر مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ میں جواب میں مسکرا نہیں سکتا...... وہ بہت سارے ہیں اور مَیں اکیلا۔ لیکن میں بے مقصد ہی وہاں رکا ہوا ہوں

_____ مین سلطانہ کو ٹھیکیدار کے جواب بیٹے کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں _____ لیکن اتنے مزدورں کے ہجوم میں مَیں اُس سے بات نہیں کر سکتا _____ میں سلطانی کے بارے میں فکر مند ہوں۔ اُسے مزدورں کی نظروں سے بچانا چاہتا ہوں۔ ''ایک بات کروں صاحب...... کیا تم میری مجدوری بڑھا نہیں سکتے...... میرے کپڑے خزاں ہو گئے ہیں۔ میں نئے کپڑے بناؤں گی _____ اور اُس نے اپنا پھٹا کُرتا مجھے دکھایا۔

میں ہنسا...... شائد سلطانہ میری نظروں کے پیغام کو جان گئی ہو ۔میں نے کہا ''نواب کو کیوں نہیں کہتی'' _____ وہ ایک دم چپ ہو گئی ...... اُس کی آنکھیں کسی دکھ سے بھیگ گئی تھیں...... وہ بولی...... ''نواب تو بس روپے جمع کرے ہے...... اُسے میرا ننگا بدن نجر نہیں آوے ہے۔''

"کیا میں بنادوں تجھے نئے کپڑے...... میں اُس کے سامنے کھڑا ہوکر بولا______ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔"ناں جی...... کپڑے تو میں اپنی مجدوری سے ہی بناؤں گی______ بس تم میری مجدوری بڑھا دو______ پر نواب کو نہ بتانا______ اور وہ جلدی سے چلی گئی......اور میں مسکرانے لگا...... بھولا پہلوان نے ہی تو کہا تھا۔شہر عورت کو بڑی جلدی بدل دیتا ہے۔باہر ماسم کی پہلی بارش ہورہی تھی۔سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے آسمان کے کنارے سے اُٹھ کر چاروں طرف پھیل گئے تھے۔میں کیبن کے دروازے میں کھڑا گھرے بادلوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھ رہا تھا اور سلطانہ کا جسم میرے تصور میں چھایا ہوا تھا۔وہ عمارت کے برآمدے میں کھڑی اُداس نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی اور پھر وہ شائد رونے لگی۔اُس کے آنس اُس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے______ دکھ بڑے آنسو______

اُس کا سنہری بدن۔کڑکتے بادل۔آنسوؤں سے بھیگے گال اور پھٹا کرتا...... انسان چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے لیے کوشاں کتنا بے بس

ہے۔ معصوم نہیں رات کا ساتھ مرد عورت کو ذہنی طور پر کتنا قرب لاتا ہے۔ کتنا دور کرتا ہے________اور کیا رات کا ساتھ ہی سب سے بڑی سچائی ہے
...... میں سوچ رہا تھا________سوچ جو مثبت نہیں تھی۔

سلطانہ بدل رہی تھی...... میں جانتا ہوں لیکن اُس کا اور میرا فاصلہ بدستور قائم ہے۔ میں ہمیشہ کا ڈرپوک آدمی ہوں۔ عزت جانے کا ڈر نوکری جانے کا ڈر۔ سلطانہ نے بہت تھوڑے وقت میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ اُس کے چہرے پر غرور اور اعتماد نے اُسے عمر سے بڑا بنا دیا ہے...... اب وہ جس سے جی چاہتا ہے باتیں کرنے لگتی ہے۔ بھولے کی دکان پر جا کر چائے پیتی ہے۔ نواب سے مار کھا کر بھی زیادہ نہیں روتی...... ساس اور سسر سے نہیں ڈرتی________بھولا ٹھیک کہتا تھا کہ اُس کی آنکھوں میں بغاوت بھری ہوئی ہے۔ شہر کی عورتوں نے غیر محسوس طور پر اُسے بدل دیا ہے________

ایک روز میں نے موقعہ پا کر کہا...... سلطانہ کبھی مجھے بھی خدمت کا موقع دو________وہ زور سے ہنسی اور بولی...... ایسی ہی بات تمہارے ٹھیکیدار نے کہی تھی۔ ایسا لگے ہے جیسے یہاں کے سارے مرد میرے ہی عشق

میں گلتاں ہیں، کسی کو کوئی اور کام ہی نہیں ہووے ہے۔ ہے نا مجے کی بات ......سچ بڑا امجا آوے ہے"......اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی______ میں اُس کی بے باکی پر حیران تھا۔ میں نے کہا۔"سلطانہ۔ کیا تجھے نواب سے ڈر نہیں لگتا......جان سے مار ڈالے گا تجھے"______

وہ بولی......"ڈرو ہوں۔ جرور ڈرو ہوں۔ لیکن اتنا جانوں ہوں۔ وہ مجھے جان سے نہیں مارے گا۔ اُس کا نخشان کون پورا کرے گا۔ میں ہی کروں گی نا۔ پھر میرے مرنے کا اُسے کیا پھائدہ۔ وہ اپنی جرورت پوری کرنے کے لیے مجھے جندہ رہنے دے گا ......جرور جندہ رہنے دے گا "______اور وہ بڑی لاپرواہی سے آگے چل پڑی______

وہ اُن ساری زیادتیوں کا بدلہ لے رہی تھی......لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ نقصان صرف عورت کا ہوتا ہے......گھاٹے میں صرف اس کی ذات آتی ہے۔ مجھے اُس کی بے باکی اچھی نہیں لگتی تھی______ جیسے اُس نے اپنی روح کی معصومیت کو بے مول ہی بیچ ڈالا ہو______ میں تو سلطانہ سے محبت کرنے لگا تھا جو نواب کی مار کھا کر بھی سہمی رہتی تھی۔ ساس کی جھڑکیاں

کھا کر بھی سر جھکا لیتی تھی...... لیکن یہ سلطانہ ______

اُس دن ٹھیکیدار کے بیٹے نے بڑی رازداری سے کہا...... کیا کسی طرح یہ سلطانہ ہاتھ نہیں لگ سکتی...... اور میرا جی چاہا میں آگے بڑھ کر اُس کا گلا دبا دوں ______ لیکن سلطانہ کولر کا ٹھنڈا پانی دینے کے لیے خود ہی آ گئی...... ٹھیکیدار کے بیٹے کی نظروں میں بھوک تھی وہ بولا ______

''آؤ سلطانہ تمہیں اپنی گاڑی میں سیر کروالاؤں۔ چلو گی میرے ساتھ۔'' وہ گھبرائی نہیں۔ بس چپ چاپ اسے دیکھنے لگی اور بولی

''صاحب میرا مرد جندہ ہے۔ مرا نہیں۔ اور اس جیسا کوئی جنا ہو ______ تو جانوں۔ اور چلی گئی ______ شائد وہ سب کچھ جو میں دیکھ رہا ہوں محض نواب کو جلانے کے لیے۔ ٹھیکیدار کا بیٹا عورت خریدنی جانتا ہے۔ عورت کا جیتنا نہیں جانتا ______ وہ غصے سے تلملاتا ہوا چلا گیا...... اور پھر اُس نے آنا چھوڑ دیا...... سلطانہ اپنے آپ کو بیچنا ابھی تک نہیں جان پائی تھی ______ اُس روز نہ جانے کیا بات ہوئی کہ نواب نے اُسے چٹیا سے گھسیٹا اور چلا کر پیٹنا شروع کر دیا۔

''حرام جادی گیر مردوں سنگ مجاخ کرے ہے۔ میں تیرے سب لچھن سمجھوں ہوں۔ میں نے پنچ ہجار اس لیے تو نہیں بھرے تھے کہ تو دوسروں کے سنگ موج مناوے۔'' ____ سلطانہ کی ساس بھی چلا چلا کر الزام لگا رہی تھی۔ گندی گندی گالیاں بک رہی تھی۔ سلطانہ زور زور سے رونے لگی۔ ''ہاں ...... ہاں۔ میں دوسروں کے سنگ موج مناؤں ہوں۔ میں نہیں رہتی تیرے سنگ۔ جالم مرد۔ دیکھ لینا ایک دن میں جرور بھگ جاؤں گی۔ تُو دیکھتا رہ جاوے گا۔'' سب نے کام روک دیا اور اُن کی لڑائی دیکھنے لگے ____ اُس کا باپ روک رہا تھا۔ لیکن وہ جنونی طور پر سلطانہ کو مار رہا تھا۔ وہ چلایا...... ''میں تجھے جان سے ہی مار ڈالوں گا۔''

بھولا پہلوان بھاگتا ہوا آیا۔ اُس نے نواب کے دونوں بازو زور سے تھام لیے اور چلایا...... ہوش کر نواب۔ مر جائے گی۔''

''تُو کون ہے روکنے والا۔'' اُس کا باپ بولا۔

''میں ہوں...... میں ہوں تمہاری بیویوں کا یار ____ سُور کی اولاد۔ بے بس عورت پر ظلم کرتے ہیں اور شرمندہ بھی نہیں ہوتے

عورت کو خرید تے ہیں بے غیرت اور پھر اس پر ظلم کرتے ہیں جیسے وہ کوئی جانور ہو۔"

سلطانہ کھلی آنکھوں سے بھولا پہلوان کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے...... پتا نہیں کیا ہوا ____ بھولا نے نواب کے بازو چھوڑ دیے اور بڑبڑاتا ہُوا واپس چلا گیا...... کام دوبارہ شروع ہو گیا ____ سلطانہ کی سسکیاں کبھی کبھار گونجتیں اور تھم جاتیں...... سب مزدور چپ چاپ کام کر رہے تھے جیسے وہ احتجاج کر رہے ہوں۔ میں وہاں کھڑا گہری اُداسی میں ڈوب گیا جیسے یہ ساری عورتیں آہوں کی زنجیر میں بندھی مسلسل منزل کی تلاش میں ہوں۔ زندگی کی تلاش میں ہوں۔ اور مرد ہاتھوں میں کوڑے لیے اُنہیں آگے دھکیل رہے ہوں۔ اُن کی برہنہ پشتوں پر مار رہے ہوں۔ سلطانہ کی بھیگی آنکھیں سارے ماحول کو سِلین زدہ کر رہی تھیں۔ یہ ٹوکری اٹھائے مزدوری کرتی خوبصورت لڑکی ہماری زندگیوں کے خانے میں کہیں بھی فٹ نہیں ہو سکتی۔ میں جانتا ہوں اس کے جسم کی قیمت تو دی جا سکتی ہے لیکن اس کی روح میں کوئی بھی جھانکنا پسند نہیں کرے گا...... وہ

ہمیشہ تنہا رہے گی...... ہمیشہ زندگی کی تلاش میں سرگرداں۔

روز کی طرح شام کا سورج ڈوب رہا ہے۔ شروع سردیوں کی ٹھنڈی ہوا جسم کو آہستہ آہستہ کپکپا رہی ہے۔ زمین سے اٹھتی دھول بھی شامل ہو کر اُسے بوجھل بنا رہی ہے۔ میں نے سَر اُٹھا کر دیکھا...... دور کھڑا ٹھیکیدار سلطانہ کو دیکھ رہا ہے۔ سورج کی کوئی آخری شعاع کسی بے در کھڑکی سے اندر آتی ہوئی سلطانہ کے سراپے کو اُجلا رہی ہے۔ اور وہ یادوں میں ڈوبی اُداس کھڑی ہے۔ یادیں جس میں اُس کا گزرا بچپن ہو گا...... ماں باپ کی ملائم شفقت ہو گی ______ مستقبل کی خواب ناک جھلکیاں ہو گی۔ کسی مزدور نے اپنا ریڈیو پوری والیوم سے کھول دیا ہے۔ جس میں کوئی برہن محبت کا نوحہ گا رہی ہے۔ محبت جو ایک عذاب ہے۔ اس عذاب سے بچنے کے لیے دل کو کوئی راہ نہیں سوجھتی۔ پتہ نہیں سلطانہ بھی اس درد کو سہارنے کی کوشش کر رہی ہو...... ٹھیکیدار بغیر مقصد کے کھڑا ہے...... میں جانتا ہوں...... وہ بھی میری طرح مایوس ہو کر چلا جائے گا ______

نومبر کا سورج دھند آلود فضا میں آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھ رہا ہے۔ کام

شروع ہونے والا ہے۔مزدور آہستہ آہستہ آ کر عمارت کے پاس جمع ہو رہے ہیں۔سلطانہ اب پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔نواب نے اُسے نئے کپڑے بنوا دیئے ہیں______رنگین چھینٹ کے کپڑے جس کے کناروں پر ننھے گھنگرو لگے ہوئے ہین......اُس کا گھونگھٹ اب کبھی کبھی کھسک کر اُتر جاتا ہے......اور ہو پھر بھی لاپرواہی سے کھڑی رہتی ہے۔سلطانہ کے چہرے پر کھلنڈرا پن ہے______بھولا پہلوان آج پہلی بار آ کر سلطانہ سے بات کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔"کیوں پہلوان جی کیا ڈھونڈ رہے ہو......کیا گم ہو گیا ہے"......وہ بولا۔گم تو نہ جانے کیا کیا ہو جاتا ہے۔میں تو صرف اپنی گم پیالیام ڈھونڈ رہا ہوں۔شائد نواب لے آیا ہو......اُس نے سلطانہ پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی______سلطانہ نے جلدی سے سَر جھکا لیا اور برتن اٹھا کر کھڑی ہو گئی______بھولا پہلوان بے دھیانی سی ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا......اور پھر چلا گیا ہے......لگتا ہے الفاظ اس کے لبوں میں قید ہو گئے ہوں______میں نے کہا۔سلطانہ......کیا نواب کی مار سے تمہیں ڈر نہیں لگتا

ـ'' اُس نے کندھے اُچکائے اور بولی ______ مار ______ مار

______ جب مرد کے پاس پیار نہ ہو تو وہ مار سے کام چلاوے ہے۔ اور جندگی صرف مار کھا کر تو نہیں گجرتی۔ میں تو اس مار سے تنگ آ گئی ہوں۔'' پھر اُس نے تالاب کے کنارے سے اپنے برتنوں کو اُٹھایا اور انہیں چولہے کے پاس رکھنے کو چل پڑی...... زندگی میں محبت کی کیا اہمیت ہے۔ انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی جان نہیں پایا۔ میں اُسے دیکھ کر محرومی کی جلن میں جل رہا ہوں۔ نواب اُسے پا کر بھی نہ پا سکا...... اور ٹھیکیدار کا بیٹا دولت رکھتے ہوئے بھی اُسے خرید نہیں سکتا۔ اب نواب سلطانہ کو پہلے کی نسبت کم مارتا ہے۔ میں جانتا ہوں پہلوان اپنی دکان پر بیٹھا سلطانہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ اُس کے چہرے پر عجیب سی ملائمت آ گئی ہے ______ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ بھی بڑی نرمی سے بولتا ہے۔ نواب سلطانہ کی تیز نظروں سے خائف ہو کر دوسری طرف رخ موڑ لیتا ہے اور بڑ بڑانے لگتا ہے ـ مجھے لگتا ہے جیسے سلطانہ کے چہرے پر استہزا آمیز مسکراہٹ کھُد گئی ہے ـ وہ میرا۔ نواب کا۔ اپنی ساس کا مذاق اُڑاتی ہوئی لگتی ہے۔ اُس کے قبیلے

کے لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں لیکن وہ بُرا نہیں مناتی۔ پتہ نہیں اُسے کس طاقت نے خود سَر بنا دیا ہے یا پھر وہ بے حسی کے اُس درجے میں داخل ہو گئی ہے جہاں سب کچھ بے قعت اور سہارے کے قابل لگتا ہے۔ دل کا دروازہ سب پر بند ہو جاتا ہے...... اُس روز جب میں ہمیشہ کی طرح داخل ہوا تھا تو نواب کے سارے رشتہ دار چہروں کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ کام کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے کام شروع کیوں نہیں ہوا۔''

تو خیرو نے کہا۔ ''آج ہم دھاڑی نہیں لگا دیں گے ہماری گیر حاجری لگا دو۔'' میں جانتا تھا کوئی بہت بڑی بات انہیں مزدوری سے روک سکتی تھی۔ عورتیں گھونگھٹ نکالے الگ کھڑی تھیں۔ اُن میں سلطانہ نہیں تھی۔ میں نے گھبرا کر پہلوان کی دکان کی طرف دیکھا۔ وہ چائے بنا رہا تھا اور بنچوں پر ایک دو گاہک بیٹھے چائے پی رہے تھے ______ ''کیا بات ہے۔'' میں غصے میں بولا۔

''بات کیا ہووے ہے صاحب۔ یہ سلطانہ ہرامجادی رات کو نہ

جانے کون عاشق سے مل کر آوے ہے۔ میں تو تھکا ہارا سو جاؤں ہوں اور یہ موجاں مناوے ہے۔ مار مار کر تھک گیا لیکن یہ منہ سے بولے ہی نہیں۔"

نواب زمین پر بیٹھ کر رونے لگا______بے بسی سے میں پہلی بار اُسے روتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے نواب کا خوبصورت وجود ایک دم بہت سکڑ گیا ہو______اُس کی طاقت کا گمان سلطانہ نے توڑ دیا تھا......سلطانہ جو خریدی ہوئی عورت تھی۔

"صاحب میرے تو پنج ہجار موپھت میں جاویں ہیں۔" ہاں۔ہاں۔ پنج ہجار جایا جاویں ہیں۔ میں عورت نہیں ہووے ہوں نا۔ کاگج کے ٹکڑے ہووے ہوں۔ میں بھی اپنی ماں جائی نہیں ہوں اگر تیرے منہ پر پنج ہجار نہ ماروں۔ چاہے میں اپنے آپ کو بیچوں ہی کیوں نا۔" سلطانہ اُس کے سامنے کھڑی غصے سے چلا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ چوٹوں سے سوجا ہوا تھا۔ اُس کے پھٹے کرتے سے اُس کا جسم نظر آ رہا تھا......اُس کی آواز اُس کی مجروح انا کی چیخ تھی______

"تُو پنج ہجار کو کیا جانے______تُو تو پنج لاکھ کما سکتی ہے

۔تیرے عاشق جو دیوے ہیں تجھے۔" نواب شیر کی طرح دھاڑا اور اُسے

مارنے لگا......لاؤ میرے پنج ہجار......جاؤ جہاں مرجی جاؤ......لاؤ میرے

پنج ہجار______

سلطانہ وہیں بین ڈالنے لگی______میں اُس کے پاس جا کر

اسے تسلی دینا چاہتا تھا______میں نے کہا______"سلطانہ

تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔تمہارے قبیلے والے عزت دار آدمی ہیں۔"

کیا تم عجت دار نہیں ہو۔تم اپنی جورو بیٹی سے کام نہیں کرواتے۔کیوں انہیں

گھر کی چاردیواری میں سنبھال کر رکھے ہو۔اس لیے نا کہ وہ تمیاری عجت

ہیں______اور ہم عجت داروں کو دیکھو______ٹوکری اُٹھوائیں

ہیں۔گیر مردوں کے سنگ کام کروائیں ہیں اور پھر بھی عجت دار بنیں ہیں

"______وہ دھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی......جیسے اُس کے اندر

سے سارے جذبات بنجر ہو گئے ہوں۔

"کہاں سے دوگی پانچ ہزار نواب کو......جانتی ہو پانچ ہزار جمع کرنا

کتنا مشکل ہے۔"میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''نواب نے بھی تو خریدا ہے مجھے۔اب میں اپنے آپ کو اپنی مرضی سی بیچوں گی۔اپنی مرضی کے گاہک کے پاس۔'' اور اُس کیا یک دم چیخ بلند ہو گئیں۔احتجاج کرتی ہوئیں۔وہ اپنی زندگی میں آئی ساری محرامیوں کا ماتم کر رہی تھی شائد...... پہلوان دکان کے تھڑے پر کھڑا اس سارے تماشے کو دیکھ رہا تھا......وہ پہلے کی طرح اندر نہیں آیا_____لیکن تیزی سے سگریٹ کے کش لگاتے اور گاڑھے دھوئیں کو باہر نکالتے ہوئے وہ بہت بے چین لگ رہا تھا......

میں اُس کے پاس چلا گیا......اور کہا...... پہلوان جی نہ جانے کون بانکا سلطانہ کا دل جیت لے گا...... کچھ جانتے ہیں آپ......''سلطانہ سے جا کر پوچھو......مجھ سے کیا پوچھتے ہو......سالا مارتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ اس سے ہمیشہ محبت کرتی رہے گی......صاحب عورت کا دل کانچ کا ہوتا ہے ......مارو گے تو ضرور ٹوٹے گا''_____اور وہ تیز تیز چلتا بازار کو مڑ گیا ......پہلوان کی دکان کا چالہا ٹھنڈا تھا۔

کام ہمیشہ کی طرح ہو رہا ہے۔مزدور سڑک کنارے روڑی کے

ڈھیر پر بیٹھے روڑی کوٹ رہے ہیں اور آپس میں فحش مذاق کر رہے ہیں ۔چھوٹی چھوٹی خوشیاں...... چھوٹی چھوٹی دشمنیاں ۔راحتوں کے لیے تگ ودو ۔روٹی کمانے کا مسئلہ ۔جذباتی محرومیاں ۔انتقام لینے کی شدید خواہش ۔خریدی گئی عورتیں ۔سروں پر اُٹھایا ہوا بوجھ______ دنیا کی تماشا گاہ میں انسان بازی گر کی طرح زندگی کے تنے رسے پر چلنے کی کوشش میں گر گر پڑتا ہے ۔نواب ۔سلطانہ ۔میں ۔پہلوان اور دنیا کے سارے انسان ۔لیکن پھر بھی چلنے پر مجبور ہے۔

میں نے جاتے جاتے سلطانہ کو مڑ کر دیکھا ہے ۔نواب سلطانہ کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا ہے ۔صبح کی ساری بات ایک تماشا لگتا ہے ۔میں مسکراتا ہوں ۔سوچ کے کتنے انداز ہیں ۔سردیوں کا چاند عمارت کی بلندی پر جھکا نیچے جھانک رہا ہے ۔چولہوں سے اٹھتا دھواں دُھند میں شامل ہو کر اُسے اور بھی گہرا کر رہا ہے ۔دُھند میں لپٹے انسان...... جینے کی کوشش ۔اوپر چاند اکیلے مسافر کی طرح اُداس چہرہ لیے دُھند کے ہلکے ہلکے بادلوں میں محوسفر ہے......راہیں ہی راہیں______ منزل کے بغیر۔

''سلطانہ بھاگ گئی۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے ہی ایک مزدور بھاگا ہوا آیا____

''کس کے ساتھ۔'' میں نے مڑ کر پہلوان کی دکان کو دیکھا۔ وہ بند تھی____ ''پتہ نہیں کس کے ساتھ......وہ نواب کے لیے پانچ ہزار چھوڑ گئی ہے جی۔ پورے پانچ ہزار۔ بڑی خراب تھی جی وہ۔ ہم تو نواب کا لحاظ کرتے رہے نہیں تو ہم بھی پیسے دے سکتے تھے۔ پتہ نہیں کون سالا بھگا لے گیا سالی کو۔'' وہ زور سے ہنسا۔

''چپ کرو۔ بند کرو یہ بکواس۔'' میں چلایا......اور مجھے لگا جیسے میرے جسم سے کوئی چیز ہولے ہولے زمین میں اُتر رہی ہو۔ سلطانہ کے رشتہ دار چپ چاپ دائرے میں بیٹھے باری باری حقے کی نے کو تھامے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ نواب ہاتھ میں پانچ ہزار روپوں کی گٹھی تھامے انہیں بار بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور سلطانہ کی ساس اپنے نومولود بچے کو دودھ پلاتے ہوئے بول رہی تھی۔

اگر کوئی جنا ہوتا تو وہ یوں نہ بھگتی۔ پاؤں کی جنجیر جو نہ تھی اور یہ نباب

بھی تو دن رات مارے تھا اُسے۔ سوچے تھا۔ عورت نا ہیں جنور ہے جنور۔ گائی بھی سوئی کھانے پر رسہ ترائے ہے۔ وہ تو آخر جنانی تھی جلم کے ساتھ کب تک نبھاہتی۔''

''جیادہ نخشان نہیں ہوا اماں۔ اب میں کوئی ہجار دو ہجار والی عورت بیاہلوں گا ______ تین ہجار پھر بھی منافع ہوا نا اماں۔'' اور وہ بڑے اطمینان سے روپوں کو اپنے صافے کے پلو میں باندھ کر اُٹھا اور ماں کو دیتے ہوئے کہا ______ پنج ہجار کو جمع کرتے کرتے میں تو اپنی آدھی جوانی بِتا دی۔ لیکن سلطانہ مجھے ایک ہی ہلے میں امیر بنا گئی ...... اور وہ ہنسے لگا ______ مجھے لگا جیسے وہاں پر بیٹھے سارے مرد خوفناک عفریت ہو گئے ہوں جو عورتوں کو منہ میں پکڑے انہیں بھنبھور کر کھا رہے ہوں۔ باقی مرد نواب کو دیکھنے لگے اور پھر ایک ایک کر کے عمارت کی طرف بڑھ گئے۔ عورتوں نے اپنے بچوں کو چارپایوں پر لٹایا اور مردوں کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

میں کھڑا سوچ رہا ہوں کیا سلطانہ ایک حقیقت تھی یا سایا۔ کیا اُس

کے دامن کے ننھے گھنگروؤں کی آواز میں نے کبھی سنی بھی تھی یا میرا تصور ہی تھا ۔میرا دل بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ بوجھ سلطانہ کے کھنے جانے کا ہے یا اپنی محرومی کا۔ اور کیا سلطانہ جینے کی راہ کی کھوج لگانے لگی ہے اور کیا راہ اُسے مل جائے گی۔ بھولا پہلوان کی دکان بند ہے اور ایک کتیا اپنے بچوں کو لیے ٹھنڈے چولہے کی راکھ میں بڑے اطمینان سے بیٹھی ہر آہٹ پر آنکھیں کھولتی اور پھر بند کر لیتی ہے۔

مَیں جانتا ہوں میں سلطانہ کی مرضی کا گاہک نہ تھا......ایسا گاہک جس کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نرمی اور چاہت سے بھیگنے لگیں

پہلوان کی دکان بند ہے اور سردیوں کا سورج بے جان چہرے ______

سے دُکھ سُکھ بھری دنیا کو جھانک رہا ہے۔

جذبے کی قیمت

آپ فضلاں کو نہیں جانتے

فضلاں میرے بیٹے انوراں کی دودھ پلانے والی دائی تھی ۔ انوراں جب دس برسوں کے انتظار کے بعد پیدا ہوا تو میری بیوی فرحت کا دودھ ہزار جتنوں کے بعد بھی نہ اترا۔ انتظار کے ان برسوں میں محیط کرب نے شائد فرحت کے اندر کی ہریاول کو بھی خزاں زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہریاول جو ماں کے جسم سے سفید دھاروں کی مانند پھوٹ بہتی ہے۔

لوگوں کی مبارکبادیں وصول کرتے ۔ ہیجڑوں پر روپے وارتے ۔ مہمانوں کا خیال رکھنے میں مردانے سے جب بھی اندر زنانے میں جاتا تو

انوار کی بھوک سے بلبلاتی آواز سنائی دیتی ......وہ بہت کمزور تھا اور اوپر کا دودھ اُسے کسی طور راس نہیں آ رہا تھا۔ فرحت کو خادمائیں ہو وقت گھیرے رہتیں۔ طرح طرح کے ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے تاکہ فرحت ماں بننے کی خوشی سے سیراب ہو سکے۔ لیکن ناکافی دودھ انوار کا پیٹ نہ بھر سکتا۔ فرحت غصے سے بھڑک اُٹھتی۔ بے وجہ نوکروں کو گالیاں دیتی...... ہر بات کا ذمہ دار اُن کو ٹھہراتی اور پھر مایوس ہو کر رونے لگتی...... وہ اپنے بیٹے کو دودھ پلانا چاہتی تھی ......لیکن ایسا ہو نہ پایا تھا۔

پھر میری اماں نے گاؤں سے ایک غریب جوان لڑکی کو بھیجا۔ انوار کو دودھ پلانے کے لیے......فضلاں کا بیٹا تین چار ماہ کا تھا......وہ غریب تھی اس لیے اُسے نوکری کی ضرورت تھی۔ اُس کا شوہر جو کماتا اپنی ہی ذات پر خرچ کر دیتا تھا۔

اب انوار کے رونے کی آواز نہ آئی...... میں جب دفتر سے آ کر اُسے دیکھتا تو وہ اپنے خوبصورت کوٹ میں طمانیت بھری مسکراہٹ لیے سو رہا ہوتا۔ لیکن فضلاں کا بیٹا ڈیوڑھی کے فرش پر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کھولے

بوسیدہ اور گندے بستر پر پڑا رہتا ...... یا لاغر سی آواز میں رونے لگتا ________ وہ پہلے کمزور ہو گیا تھا ________ کٹوری بھر دودھ اُس کے لیے نا کافی ہوتا اور روٹی کے ٹکڑے گرد آلود ہو کر اُس کے ارد گرد بکھرے رہتے۔ اگر فضلاں اُسے اپنا دودھ پلا دیتی تو فرحت چلاتی ......

"دیکھو اگر میرا بیٹا بھوکا رہا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ اتنی جوتیاں لگاؤں گی ...... اتنی لگاؤں گی کہ یاد رکھو گی۔ مت چھوؤ اُسے۔ میرا بچہ بیمار ہو جائے گا ________ فضلاں جلدی سے اُسے واپس لٹا دیتی۔ اور اس کی کمزور سی آواز دکھ بھری لے کی طرح گھر کی فضا میں گھومتی رہتی ...... میں جو اپنے خاندان کی بڑائی پر ہمیشہ نازاں رہا ہوں۔ فضلاں کے بیٹے کو زمین پر پڑا دیکھ کر ناگواری سے ایک طرف ہٹ کر جلدی سے گزر گیا ...... آخر وہ یہاں کیوں آئی تھا ...... میرا ذہن اس سے زیادہ سوچ نہ پایا۔ لیکن ہم اُسے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ میں جانتا ہوں انسانوں انسانوں میں کتنا فرق ہے۔ انوار اور فضلاں کا بیٹا ...... فرحت اور فضلاں ________ مامتا بھی خریدی جاسکتی ہے۔ بیچی جاسکتی ہے۔ اور فضلاں مامتا بیچ رہی تھی۔

میری بیوی فرحت کو درجنوں انسانوں کو کام میں الجھائے رکھنے کا گر خوب آتا ہے اسے وہ غریب لوگ ایک آنکھ نہیں بھائے جو سردیوں میں دھوپ میں یا گرمیوں میں سائے میں بیٹھ کر وقت کا تھوڑا سا بھی حصہ گزارنے کا خواہش رکھتے ہوں وہ ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ کہتی انہیں اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔

میں فضلاح کے بیٹے کی مسلسل روتی آواز سے بے زار ہو چکا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ کسی طور خاموش ہو جائے ______ لیکن جب بھی میں آتا وہ چھوٹی سی گھٹی گھٹی آواز میں رو رہا ہوتا۔

ایک روز میں نے کہا ''فضلاں کے بیٹے کو زیادہ دودھ دے دیا کرو۔ سارا دن چلاتا رہتا ہے۔ میں پریشان ہو گیا ہوں'' اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا فضلاں نے شکایت کی ہے اور میں جو اس کی شکی طبیعت سے واقف تھا ایک دم باہر چلا گیا ______ میں نے غلط بات کہہ دی تھی۔ اب میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے اکلوتے بچے کی

ماں تھی...... اور یہ بچہ میری جائیداد اور نسل کا وارث تھا۔

اب فضلاں کا بیٹا خود ہماری زندگی کا ایک بہت ہی اہم جز بن چکے تھے...... فضلاں نہیں جا سکتی تھی اس لیے فضلاں کا بیٹا بھی کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اور اس کا خالی پیٹ شاید کبھی نہیں بھرتا تھا۔ وہ سوتے میں بھی سسکاریاں لیتا ______ اکثر ایسا ہوتا آدھی رات کو انور بھوک کے مارے رونے لگتا تو فضلاں کو اندر کمرے میں بلا لیا جاتا وہ انور کو گود میں لے کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور دودھ پلانے لگتی...... اس کا جوان نیم برہنہ پیٹ نظر آنے لگتا...... وہ نیند بھری آنکھوں سے سوتی جاگتی رہتی...... اپنے بیٹے کی آواز پر بے چین ہو اٹھتی لیکن پھر اونگھ جاتی...... اور میرا دل رحم سے بھر جاتا...... لیکن انور میرا اکلوتا بیٹا تھا...... فضلاں کے بیٹے کے مقابلے میں بہت بلند اور اہم ______ صبح جب میں جاگتا تو وہ ویسے ہی بیٹھی سو رہی ہوتی اور انور پرسکون مسکراہٹ لیے اس کی آغوش کی گرمی اور نرمی میں طمانیت سے سمٹا ہوتا ______ میں اندر سے الجھ جاتا ______ وہ عورت تھی ______ عورت جو انسان کو جنم دے سکتی ہے جو مرد کو لبھا سکتی ہے

اور وہ مجھے غیر محسوس طور پر لبھا رہی تھی ______ میں بنیادی طور پر وفادار آدمی ہوں ______ پر آپ جانتے ہیں مرد کی وفا کا رشتہ اس کی بیوی سے زیادہ اس برتری کے ساتھ گہرا ہوتا ہے جو اسے سربلند کرتی ہے اور زمین پر اس کے قدموں کی دھمک کو زیادہ معتبر بناتی ہے......فضلاں کا جوان جسم اور انور......میں اور فضلاں ______ مجھے لگتا جیسے وہ انور کے ناطے مجھ سے بھی تعلق رکھتی ہو وہ انور کو دودھ پلا کر بڑا کر رہی تھی ۔ میری نسل کی محفظ تھی لیکن فرحت......فرحت کی تیز نظروں نے ہمیشہ مجھے اپنے حصار میں قید رکھا ہے......مجھ میں فضلاں سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا ۔ اس تک پہنچنے کا یارا نہیں تھا حالانکہ وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہی تو تھی ______ اب اکثر آتے جاتے میں اس کے بیٹے کے پاس بسکٹ یا مٹھائی کا ٹکڑا رکھ دیتا ۔ اس کے گندے چہرے کو ایک ساعت کے لیے چھوتا......میں اس کا شکر گزار تھا کہ وہ میرے بچے کے حق میں اس ممتا بھری گود سے دستبردار ہو گیا تھا جس پر صرف اس کا ہی حق تھا ______ لیکن زندگی کی ضروریات ______ اکثر اس کے رونے کی آواز انور کی آواز میں بدل

جاتی اور میرا جی چاہتا اگر وہ صاف ستھرا ہوتا تو میں اسے ضرور اٹھا لیتا لیکن وہ کپڑے سے گھسٹ کر زمین پر آ جاتا اور رینگتا ہوا کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔ زمین کے حقیر کیڑے کی مانند میرے بیٹے کے وجود نے میرے دل کا ایک ایسا کونا وا کر دیا تھا جس میں اب فضلاں کا بیٹا بھی سما سکتا تھا۔ اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی نیکیاں جن سے میں پہلے آگاہ نہیں تھا۔

اور پھر فضلاں جو چند روپوں کے بدلے اپنی ممتا بیچ رہی تھی ______ اور ہم برتر انسان اس کے خریدار تھے ہم شاید اس پر احسان کر رہے تھے ______ ہماری خود غرضی قابل معافی تھی ...... ہم ہمیشہ غریبوں کے خون پر ہی تو پرورش پاتے رہے ہیں ...... اسی چیز سے نفرت نے ہی مجھے اس کڑے زمیندارانہ معاشرے سے الگ نوکری کرنے پر مجبور کر دیا تھا ...... میں اس سختی میں حصہ دار نہیں بننا چاہتا تھا لیکن پھر بھی میں مکمل طور پر اس سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اکثر میں ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ______ گرمیوں کی تیز لو چلنے لگی تو میں نے پہلی بار اپنے گھر میں ائیر کنڈیشنز لگوایا۔ باہر کی جلتی فضا کمرے سے پرے ہی رہ جاتی ...... اور

فضلاں کا بیٹا پسینے اور گرد میں آلودہ فرش پر اوندھے منہ سویا رہتا ______

فضلاں کمرے میں بے چین ہو جاتی لیکن فرحت کی نظروں سے ڈر کر خاموش انور کو لیے بیٹھی رہتی......شاید غیر محسوس طور پر وہ انوار کی معصوم محبت میں گرفتار ہو گئی تھی......یا وہ اب اس آرام بھری زندگی کی عادی ہوتی جا رہی تھی......ایسی آرام بھری زندگی جس میں اس کا اپنا بیٹا شامل نہیں ہو سکتا تھا میرا جی چاہتا میں فضلاں سے اسے اندر لے آنے کا کہوں......لیکن میں فرحت کے مزاج سے واقف تھا......اور فضلاں محض ایک معمولی خادمہ تھی اگرچہ اس کا کچا معصوم وجود مجھے پریشان کرنے لگا تھا ______ اب وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکراتی اور سر جھکا لیتی۔شاید میری نظروں کی طلب کی اشتہا نے اسے آگاہ کر دیا تھا۔لیکن خادماؤں سے بھرے گھر میں اس تک میں کسی طور نہیں پہنچ سکتا تھا۔جب رات کا نیم روشن اندھیرا ہمارے کمرے میں پھیل جاتا تو فضلاں کا نیم برہنہ جسم زیادہ روشن لگنے لگتا ______

لیکن ______ اور میں جلدی سے دوسری طرف کروٹ لے لیتا۔تب انوار فضلاں اور فرحت کے درمیان معلق میرے ذہن پر رقصاں ہو

جاتا۔لیکن پھر صرف فضلاں رہ جاتی سب کچھ گہری دھند میں دفن ہو جاتا _______ میرا ذہن خواہش کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا۔یہاں تک کہ میں تھک کر سو جاتا۔شاید میں ضرورت سے زیادہ بزدل تھا...... یا اپنی ٹھہری ہوئی زندگی میں کسی ہلچل کا خواہشمند تھا۔

فضلاں کا بیٹا بیمار ہو کر بہت ہی زرد اور لاغر ہو گیا۔وہ واپس جانا چاہتی تھی لیکن انوار......فرحت کسی کے ہاتھ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیج کر دوائی منگوا دیتی جو اکثر وقت نہ ہونے کی وجہ سے فضلاں اسے پلا نہ پاتی _______ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چہرے کی ہڈیوں میں گھری اور بھی بڑی بڑی لگتیں۔جب بھی میں دفتر سے آتا وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھتا اور پھر بڑی بے صبری کے ساتھ اپنے گندے ہاتھوں کو آگے بڑھا دیتا۔بسکٹ کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلتی اور غائب ہو جاتی اس کا گندہ وجود میرے دل میں نامعلوم نفرت سی بھر دیتا۔یہ انوار کی طرح خوبصورت اور صحت مند کیوں نہیں تھا شاید خودغرضی میری بھی فطرت میں شامل تھی۔اور شاید فضلاں کے وجود کی خواہش بھی

میری خودغرضی کی طلب ہی تھی اور اس کے بیٹے کا خیال بھی مجھے اسی حوالے سے آتا تھا۔ میں پاکیزہ کا دعوہ دار نہیں ہوں _______ لیکن نہ جانے کیوں فضلاں کا تصور انوار کے ننھے سے جسم سے لپٹا ہوتا اور پھر وہ مجھ سے دور ہٹتا جاتا بہت دور _______ لیکن تعلق کی ڈور تھی جو کسی طور نہ ٹوٹتی ......اور میں اس تعلق کے اظہار کے لیے کبھی کبھار فرحت کی نظر بچا کر اسے کچھ روپے تھما دیتا۔ جو وہ خاموشی سے لے لیتی اور کسی حکم کی منتظر رہتی......لیکن میں اسے کچھ بھی نہ کہہ پاتا......شاید میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اس کا مشکور تھا یا کوئی چھپا مردانہ جذبہ اظہار کی راہ ڈھونڈتا تھا۔

فضلاں کا بیٹا باسی روٹی کے ٹکڑے کھا کھا کر شدید بیمار ہو گیا۔ اور اب فضلاں کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی فرحت انوار کی دوسری خوراک بھی دینے لگی تھی......بکری کا دودھ اسے راس آ گیا تھا _______ اس لیے فضلاں کو واپس گاؤں بھیج دیا گیا۔ مجھے لگا جیسے رنگ کی ایک لہر بڑھ کر جذبوں کی ریت میں کھو گئی ہو۔

جاتے ہوئے فضلاں نے انوار کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے

کہا۔ ''انوار سائیں شاید میں نے تمہیں اپنے بیٹے کے مول لیا ہے اپنی دائی کو بھول نہ جانا اس کی آنکھیں ممتا کے جذبے سے بھیگی ہوئی تھیں...... ممتا جو سمندر کی طرح اتھاہ گہری اور وسیع ہوتی ہے یا فضلاں بھولی تھی اور زندگی کی تلخیوں کو نہیں جانتی تھی۔ یا مانتی تھی لیکن مجبور تھی ______ جب میں اس کو نوکر کے ساتھ گاڑی پر سوار کروانے گیا تو اس نے کہا۔ ''سائیں آپ کا وجود فرحت بی بی کے غصے کے سامنے بڑا حوصلہ لگتا تھا میں آپ کی قرض دار ہوں ______ میری جان بھی آپ پر واری...... ہم ماں بیٹا تاحیاتی آپ کے غلام ہیں'' اور وہ رونے لگی ______ لیکن اس کی آنکھوں کی وہ بے چینی مٹ گئی تھی جو اپنے بیٹے کی دوری نے اس کی آنکھوں میں مستقل بھر دی تھی۔ وہ بڑی پر سکون لگ رہی تھی ______ مجھے لگا جیسے وہ فرحت اور مجھ سے بلند ہو بلند حوصلہ ہو ______ میں نے سو کا نوٹ اس کے بیٹے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''فضلاں میں اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے تمہارا مشکور ہوں۔ اب اپنے بیٹے کا علاج کروانا اس کا خیال رکھنا''...... وہ تشکر سے ہنسی

اور بولی...... ”سائیں غریبوں کے بچے نازک نہیں ہوتے...... دیکھیں ابھی تک جی رہا ہے مرے گا نہیں سائیں آپ کی خدمت بھی تو کرنی ہے اس نے بڑا ہو گا...... لمبی حیاتی پائے گا“ ______ ”خدا کرے“ میں نے دل میں دعا مانگی ______ گاڑی چل پڑی اور میں پلیٹ فارم پر کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا ان دو انسانوں کو جو زندگی کو گرفت میں لینے کی جدوجہد میں کوشاں تھے۔

انوار چند روز بے چین رہا...... اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ فرحت کے وجود کو ٹٹولتے...... لیکن فرحت کا بنجر وجود اسے مایوس کرتا تو وہ رونے لگتا ______ لیکن پھر فرحت نے پیار کی جنگ جیت لی میری سوچوں سے چند دن بعد ہی فضلاں اور اس کا بیٹا محو ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ہم گاؤں گئے تو پتہ چلا کہ فضلاں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے ______ میرے منہ میں کڑوا سا مزہ بھر گیا...... یہ سوچ کر میں پریشان ہو جاتا کہ انوار کی رگوں میں ایسا ہی دودھ شامل ہے جو کسی نسل والی عورت کا نہیں...... لیکن پھر بھی اس کی زندگی کا ضامن بنا تھا۔ اور اب

ہمیں اس کی ضرورت بھی تو نہیں رہی تھی...... وہ ہماری زندگی اور یادوں سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی تھی

سندھ کے دور دراز علاقے میں میری تبدیلی ہو گئی نہر کی کھدائی کرتے مزدور بڑی بڑی ٹوکریوں میں مٹی ڈھوتے قطار میں آجا رہے ہوتے ۔اوپر سورج کی تمازت سے سرخ آسمان بڑا ہی اداس اور اجاڑ لگتا اڑتی دھول میرے خیمے کے سامنے تنی رہتی اور میں اندر بیٹھا کھدائی کے نقشوں اور کام کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔

لیکن جب شام کا سورج بڑے سے چٹیل میدان کے ابھرے ہوئے کنارے کے دوسری طرف اترنے کی کوشش کرتا اور دور آسمان کے کنارے کے پاس پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کرتے تو میں اپنی جیپ میں بیٹھ کر علاقے کے بڑے زمیندار خداداد کی طرف چل پڑتا میرے پیچھے مزدوروں کے چولہوں سے اٹھتا دھواں اور آواز کا شور زندگی کی تال بن کر ابھرتا ____ میں عادی پینے والوں سے نہیں ہوں لیکن میزبان کا ساتھ دینے کے لیے چھوٹے سے جام کو ہاتھ میں تھامے اس کی باتیں سنتا

رہتا۔اس کے شکاری کتے سدھائے ہوئے عقاب۔زرخرید غلام۔زمینوں کی وسعت علاقے کی سیاست......عورتوں کی خوبصورتی کے قصے......مشہور گانے والیاں طرح دار ناچیاں......اس کی محبوبائیں......وہ بڑا وڈیرا تھا اور اس کے شوق بھی بڑے تھے جو مجھ جیسا انسان نہیں نباہ سکتا تھا ____ اور میں اس کی طرز کا آدمی بھی نہیں تھا۔لیکن پھر بھی ہم اچھے دوست تھے ____ ضرورت نے ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک کردیا تھا۔

ایک روز اس نے ہنس کر کہا "حسن صاحت میرے یہاں سے کوئی کامی لے جائیں دل بھی بہلا رہے گا اور گھر جیسا کھانا بھی ملے گا آپ تو بالکل اکیلے ہیں۔"

میں ہنس دیا میں نے کہا......میرا نوکر میرا بڑا خیال رکھتا ہے اور صحبت دوستاں ____ وہ آپ پوری کردیتے ہیں مجھے کسی چیز کی ضرروت نہیں۔

"اور رات کی بات اچھا اگر آپ میرا احسان اٹھانا نہیں چاہتے تو خرید لیجئے گا......چند دنوں بعد میلا لگنے والا ہے۔"

"کیا یہاں عورتیں بھی میلے میں بکتی ہیں" میں حیران ہو کر بولا......

"اگر بھیڑ بکری بک سکتی ہے تو عورت کیوں نہیں بک سکتی۔ وہ کون سی آسمانی مخلوق ہے آپ چل کر تو دیکھئے گا کبھی کبھی اچھے چہرے بھی مل جاتے ہیں۔"

میں اس سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکا...... میں جانتا ہوں ہر علاقے کے اپنے راز ہوتے ہیں وہ شاید مجھے اپنی نوازشوں سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاقے کی بنجر زمینیں سیراب ہونے والی تھیں۔ اس کی دولت اور دبدبے میں اضافہ ہونے والا تھا اور میں اس علاقے کا یاس، ڈی، او تھا۔

اس دن میلے کی چھٹی تھی صبح سے ہی مزدور دھلے کپڑے پہن کر رنگین شیشوں والی ٹوپیاں او واسکٹیں پہنے سرخ نیلی اجرکیں اوڑھے پاؤں سے دھول اڑاتے میلے کی طرف جا رہے تھے۔ اوپر آسمان پر سفید بادل ایک دوسرے سے پیوستہ چپ چاپ اونٹوں کی قطار کی طرح غیر محسوس رفتار سے محوسفر تھے۔ لیکن مجھے زندگی ایک ساکت وجود کی طرح لگ رہی تھی۔ میرے نوکر نے کہا۔ "صاحب جی آپ میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے ______ میں

نے کا رحموں مجھے بھلا وہاں سے کیا خریدنا ہے۔ جب گھر جاؤں گا تو بازار سے جا کر خرید لوں گا ____ میلے کی گرد کون پھانکے......۔

وہ ہنسا...... پر صاحب آپ ضرور جاؤ...... ہمارے علاقے کی ساری چیزیں وہاں ہوتی ہیں...... بڑی اچھی اچھی چیزیں اور صاحب ایک بات اور...... اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا ____ صاحب وہاں جوان سوانیاں بھی بکتی ہیں...... پر بڑی رازداری سے۔ میں نے کہا۔ ''رحموں یہ کیسی رازداری ہے جسے مت بھی جانتے ہو'...... اور کون بیچتا ہے انہیں'' ......صاحب بڑے بڑے ٹھیکیدار ہیں...... اور پھر غریب ماں باپ جوان عاشق لاچار خاوند لالچی مائیں پتہ نہیں کہاں کہاں سے آتی ہیں وہ سوانیاں......صاب سچ پوچھو تو رحم آتا ہے ____ بیچاریاں چپ چاپ بک جاتی ہیں ____ جو خریدے اس کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔

میں نے کہا'' رحموں تم جو کنوارے پھر رہے ہو کیوں نہیں خرید لیتے ایک بیوی......'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا...... ''صاب گھر پاک عورت سے بستا ہے چالو عورت بھی کبھی گھر بنا سکتی

ہے...... میں پیسے جمع کر رہا ہوں...... بڑی دھوم دھام سے بیاہ کروں گا"...... چالو عورت...... پاک عورت...... میری بیوی فرحت...... میلے میں بکنے والی سوانیاں...... زندگی کے رنگ...... میں نے مسکرانا چاہا لیکن میرا سارا وجود اندر سے تن گیا...... نہ جانے کیوں اس اطلاع نے میرے اندر نفرت بھر دی تھی...... یہ کیسا علاقہ تھا جہاں عورتوں کی منڈی لگتی تھی...... زمانہ آج بھی ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا...... بلکہ زیادہ خود غرض اور ظالم ہو گیا تھا۔

جب میں زمیندار خداداد کے ساتھ میلے کے میدان میں داخل ہوا تو انسانوں کی رواں لہر اپنی فطری سادگی کے ساتھ وقتی مسرتوں میں گم تھی۔ تازہ جلیبیاں کھٹے پکوڑے مٹی کے رنگین برتن کانچ کی چوڑیاں سرخی مائل دھول اڑ رہی تھی اور اس دھول میں سرخ چہروں والے جوان۔ سیاہی مائل عقابی آنکھوں والے ادھیڑ عمر مرد گھونگھٹ نکالے رنگین کپڑوں میں لپٹی عورتیں اور حیرانی اور مسرت سے چمکتی آنکھوں والے بچے زندگی کی تپش سے دھکتے پھر رہے تھے۔

لوگوں کا سلام لیتے جب وڈیرا خداداد اس خیمے میں داخل ہوا تو

میلے کی ڈھول بہت دور رہ گئی تھی...... خیمے کی دیوار کے ساتھ بہت سی عورتیں قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں...... جوان بدصورت ______ ادھیڑ عمر معصوم چہروں اور خوفزدہ نظروں والی عورتیں...... میں مرد تھا لیکن پھر بھی اندر سے خوفزدہ ہورہا تھا۔ انسان جانوروں کی طرح خریدے بھی جاسکتے تھے۔ چند مرد ایک جوان ہوتی لڑکی کا سودا چکا رہے تھے وہ اس کے پاس کھڑے اس کا منہ کھلوا کر دیکھ رہے تھے پھر ان کے ہاتھ اس کے سینے سے ہوتے ہوئے اس کی رانوں کو ٹٹولنے لگے۔ دلال بڑی مہارت سے اس کے جسم کی خوبیاں گنوا رہا تھا...... اس کی عمر بتا رہا تھا مجھے لگا جیسے ساری انسانیت نیلام ہو رہی ہو۔ پھر انہوں نے طے شدہ روپے گنے اور اس لڑکی کو لے کر چلے گئے جاتے ہوئے لڑکی ایک بوڑھے آدمی کی طرف بازو اٹھا کر چلائی...... نا بابا نا...... نہ بیچو...... نہ بیچو...... لیکن پھر خیمے کے باہر اس کی آواز دور ہوتی گئی...... دلال نے نوٹوں کی گڈی سے کچھ نوٹ گن کر بوڑھے کو تھمائے...... بوڑھے کی کمزور آنکھوں میں ہوس زر کی روشنی چمکی اور وہ اپنے بوڑھے وجود کو گھسیٹتا خیمے سے باہر چلا گیا۔ میرا سارا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا...... جب میں

نے اپنا سوچوں سے بھاری سر اٹھایا تو مجھے فضلاں نظر آئی......اس کی آنکھوں کی ویرانی اور چہرے کی بے رونقی ایسا نقاب تھا جو اسے چھپانے کے لیے کافی تھا......لیکن پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اور شاید وہ بھی مجھے جان گئی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ پھر ایک ادھیڑ عمر مرد نے اسے بھی خرید لیا تھا۔ شاید وہ زیادہ روپے ادا نہیں کر سکتا تھا ــــــــ وہ صرف عورت کا خواہاں تھا...... چہروں کی خوبصورتی کا متلاشی نہیں تھا۔

میں نے دیکھا فضلاں کی آنکھوں میں بے تعلقی سی تھی......شاید گزرے برسوں نے اسے بے حس کر دیا تھا......میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے مجھے سلام کیا اور کہا...... "سائیں نے مجھے پہچانا"......میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا......گھر میں تو سب خیریت ہے"......اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا اس کا خریدار بازو سے گھسیٹتا باہر لے گیا ــــــــ

خداداد نے کہا ــــــــ "کیا تم اسے جانتے ہو" ــــــــ

ہاں......وہ میرے بیٹے کی خادمہ تھی" ــــــــ میرا دل نہ جانے غم سے

بوجھل کیوں ہو رہا تھا۔

اور پھر اس کا عاشق اسے بھگا لایا...... دل بھرنے پر اسے کسی عورتوں کے دلال کے پاس بیچ گیا...... ان عورتوں کی یہی کہانی ہوتی ہے" ______ وڈیرا خداداد زور سے ہنسا...... "یہ دل بڑا خوار کرتا ہے عورتوں کو"...... وہ آگے بڑھ کر ایک جوان لڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر بولا ______ یہ دیکھو اچھی ہے...... لیکن اگر تم اپنی پرانی خادمہ کو خرید لیتے تو اچھا رہتا ______ سستی مل جاتی اور تمہیں جانتی بھی تھی۔

میں تیز چلتا باہر آ گیا...... کڑوا سا احساس میرے وجود میں تیزی سے گھل گیا تھا میں نے کبھی اس عورت کی خواہش کی تھی اس عورت کی جو نہ جانے کہاں کہاں بیچی جاتی رہی تھی ______ روپیہ...... بارہ سو...... ہزار...... میں اسے خرید سکتا تھا...... لکین کس لیے...... میں عورتوں کا رسیا نہیں تھا...... لیکن میں اسے گزری اذیت بھری زندگی سے نجات دلوا سکتا تھا...... انسانوں کی خود غرضیاں...... احساس کی کمی برسوں پہلے کا وجود مجھے یاد آ رہا تھا...... اور میرے کمرے کا نیم روشن اندھیرا...... انوار اب دس بارہ

برس کا ہو چکا تھا...... تو اتنے برس اسے بکتے ہو گئے...... نہ جانے کتنے ہاتھوں نے ہر رات اسے ٹٹولا ہو گا...... اور اب...... میں اسے کیا کرتا۔

خداداد خاموشی سے آ کر دوسری سیٹ پر بیٹھ گیا...... میں جانتا ہوں تم پریشان ہو میں بتاؤں دنیا میں ہر چیز بکتی ہے صدیوں پرانا کاروبار ہے اسے آج تک کوئی نہ روک سکا۔ اور نہ کوئی روک سکے گا ______ احتجاج کا کیا فائدہ۔

"لیکن انسان جنس میں شمار نہیں ہوتا۔"

"شمار ہوتا ہے حسن صاحب...... جانور بھی تو کھاتے ہیں سانس لیتے ہیں اور جنتے ہیں اور دنیا بھری پڑی ہے اس جنس سے۔"

"سب کچھ بکتا ہے تو سب کو بیچ ڈالنا چاہیے کیا آپ کو...... مجھے ______ " میں طیش سے بولا ______

"ہاں صرف خریدار کی ضرورت ہے ایسے خریدار کی جو اس کا مصرف جانتا ہو دولت بے کار میں نہیں گنوائی جا سکتی نا۔" ______

"کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں۔"

''ہاں میں خریدتا ہوں اپنی ضرورت کے مطابق'' اور مجھے لگا جیسے وہ ابھی مجھے بھی کھڑا کر کے میری بولی لگا دے گا۔''......

اپنے خیمے میں آ کر میں چپ چاپ لیٹ گیا۔ میرا کام ابھی نامکمل تھا۔ یہ نئی نہر جو بانجھ زمین کو بارآور کرنے والی تھی۔ پتہ نہیں کتنے انسانوں کو غلام بنائے گی۔ میں یہاں اب مزید نہیں رہنا چاہتا تھا ___ میں نے اپنی ٹرانسفر کے لیے ہیڈ آفس لکھا......اور بڑی تگ و دو کے بعد میری تبدیلی واپس پرانے شہر ہو گئی۔ اس روز کے بعد میں بہت کم خداداد کے ڈیرے پر جاتا تھا۔ اکثر وہ میرے پاس آ جاتا......ضرورت کی چیزوں سے لدا ہوا پھندا محبت کے لفظوں سے بھرا ہوا ___ جانے سے پہلے آخری بار جب میں اس سے ملنے کے لیے گیا تو وہ کہنے لگا۔ حسن صاحب تم بڑے بھولے آدمی ہو دوسرے ایسی جگہ آنے کے لیے رشوت دیتے ہیں......اور تم نے یہاں سے جانے کے لیے جدوجہد کی۔

میں نے کہا ______ خداداد صاحب میں بڑا نیک نہیں ہوں......لیکن نہ جانے کیوں اس میلے والی رات کے بعد میرا یہاں جی ہی

نہیں لگا ______ مجھے یہاں سے خوف آنے لگا ہے۔"

"شاید تم کو اپنی خادمہ کو دیکھ کر رنج ہوا ہے...... لیکن میں تو یہ بتانا ہی بھول گیا کہ میں نے اس کو خرید لیا ہے...... اندر زنانے میں خدمت کرتی ہے...... تم اسے ساتھ لے جانا چاہتے ہو تو میری طرف سے حقیر تحفے کے طور پر لے جاؤ۔ میں نے سوچا تھا کم از کم وہ میرے یہاں پیٹ بھر کھانا تو کھائے گی۔ اس دن تمہارے چہرے کے کرب نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔

یہ سن کر میرے دل سے ایک بوجھ اتر گیا میں نے کہا...... خداداد صاحب میں اسے لے جا کر کیا کروں گا...... وہ آپ کے ہاں ہی مناسب ہے......"

جیپ گاؤں کی سڑک کی طرف مڑی تو فضلاں سڑک کے کنارے جا رہی تھی میں نے جیپ کو روکا اور نیچے اتر آیا...... وہ بغیر کچھ بولے سر جھکا کر رونے لگی...... میں نے کہا...... فضلاں تمہارا بیٹا تو اب بڑا ہو گیا ہو گا" ______

"میرا بیٹا ______ سائیں کیا گاؤں میں آپ کو کسی نے نہیں

بتایا کہ وہ تو آپ کے یہاں سے آنے کے چند دن بعد ہی مر گیا تھا۔ آپ نے سو سو روپیہ دیا تھا...... پر سائیں موت سے بچانے کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی ــــــــ اور سائیں اس کے مرنے کے ساتھ ہی میری بربادی شروع ہوگئی ــــــــ مجھے دوبارہ بچہ نہ ہوا تو میرے گھر والے نے کہا ــــــــ ''بانجھ زنانی تو پتھر ہوتی ہے میں کب تک تمہارے ساتھ سر پھوڑوں ــــــــ اور پھر ایک رات اس نے مجھے دلال کے ہاتھ بیچ دیا نیا بیاہ رچانے کے لیے اولاد جننے کے لیے وہ رو رہی تھی اور مجھے لگا جیسے اس کی بربادی کی لمبی کہانی ہمارے ہی وجود سے شروع ہوئی تھی...... فرحت سے...... انوار سے...... اور میں بھی اس میں شریک تھا۔ وہ چلا چلا کر بین ڈالنے لگی جیسے گزرتے برسوں کا سارا دکھ اس کی آنکھوں کی راہ سے بہہ جانا چاہتا ہو ــــــــ وہ میرے پاؤں میں جھک گئی ــــــــ اپنی عمر سے کہیں بڑی اور لاغر۔

''سائیں میں تب سے لے کر آج تک بکتی ہی آ رہی ہوں۔'' مجھے وہ ساری افواہیں یاد آنے لگیں جو فضلاں کے غائب ہونے پر گاؤں میں

پھیلی تھیں۔ فضلاں بھگ گئی...... فضلاں آوارہ ہوگئی......

میں نے کہا...... ''میں واپس جا کر تمہارے شوہر کو پوچھوں گا......''

''کیا فائدہ سائیں......اب کیا فائدہ......میری ساری حیاتی خزاں ہوگئی ــــــــ اور پھر بھی وہی تو ایک مرد ہے جو اب بھی میرا کچھ لگتا ہے......میرے مرے بچے کا باپ ساری دنیا میں میرا اپنا'' ــــــــ

انوار کا پوچھنے پر اس کی آنکھوں میں ایک جوت سی جلنے لگی......نہ جانے وہ جون سی یادوں کی لو تھی ایسی لو جو ممتا کی روشنی سے بھڑکتی ہے یا کسی محبت کی یاد سے ابھرتی ہے ایسی محبت جو خود جان بوجھ کر کی گئی ہو۔ جس کی بھاری قیمت ادا کی گئی ہو۔

میں نے چند نوٹ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے کہا۔ فضلاں گاؤں واپس جانا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو......''

وہ بے بسی سے مسکرائی......گاؤں پتہ نہیں جی میرا کوئی گاؤں بھی تھا یا نہیں ــــــــ میں تو راہوں کی دھول ہوں۔ میری ماں بہنوں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائیں سائیں۔ مردے کو جیتے بندے ہمیشہ یاد

نہیں رکھتے۔ وہ مجھے رو پیٹ چکی ہو گی۔'' اس کی گدلی آنکھیں اور بھی گدلی ہو گئیں۔ حالانکہ صرف دس برس ہی تو گزرتے تھے۔ جیپ میں بیٹھ کر میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا...... وہ وہیں کھڑی خالی گود اور خالی نگاہوں سے ویران سڑک کو دیکھ رہی تھی ______ شاید وہ تو اتنا بھی نہیں جانتی کہ اس کی بربادی کے ذمہ دار کون ہیں ______ اور اگر جانتی تھی تو سزا دینے کی مجاز نہ تھی۔ وہ تو سزا بھگتنا جانتی تھی...... اور نہ جانے کب تک بھگتتی رہے گی۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب میں گاؤں گیا تو میرے کھیتوں پر مند مند بہتی ہوا شریر بچے جیسی چلبلاہٹ لئے ان پر پھسل رہی تھی۔ کوے طمانیت بھری اڑانیں بھرتے فصلوں میں اترتے اور ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ پر اڑ جاتے چیلیں چیں...... ایں...... ایں کی لمبی آواز نکالتیں اور پر پھیلائے اوپر کو اپنی ہم جنسوں کے دائرے میں شامل ہو جاتیں۔ لگتا تھا جیسے زندگی فطرت کی نرم آغوش میں غنودگی بھری آنکھوں سے سب طرف دیکھ رہی ہو۔ چڑیوں کی طرح پھدک رہی ہو ______

اور میں خوش تھا کہ میری اتنی بڑی جائیداد کا وارث موجود تھا......اور انوار کے ساتھ مجھے برسوں بعد فضلاں پھر یاد آئی تھی۔ فضلاں جس نے میرے بیٹے کی زندگی کے لیے اپنا بیٹا قربان کر دیا تھا......میں نے فرحت سے ذکر کیا تو وہ بولی۔ ”آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں غریبوں کی اولاد مرتی ہی رہتی ہے ہم نے اس کے دودھ کا معاوضہ پورا ادا کیا تھا......ہم اس کے بیٹے کی موت کے ذمہ دار نہیں ہیں ______ ایسی ہزار جانیں قربان میرے لال پر......“

لیکن میرے اندر کا انسان اس مفروضے کو آسانی سے قبول نہیں کر رہا تھا۔ میں تلافی کرنا چاہتا تھا......

میں نے خداداد کو خط لکھا کہ وہ فضلاں کو کسی کے ساتھ بھجوا دے......میں اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس نے جواب دیا فضلاں کو تپ دق ہو گئی تھی اس لیے اس نے اسے گھر سے نکال دیا تھا......وہ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس بات کا اسے افسوس ہے۔“

میں افسوس زدہ اس خط کو تھامے بیٹھا رہا تھا جیسے کوئی چیز ہمیشہ کے

لیے گم ہو گئی ہو ______

وقت کی زنجیر واقعات کو باندھے آگے کی طرف کھسکتی رہی......انوار جوان ہو گیا اور میں بوڑھا......پھر ہم نے اس کی شادی کر دی ______ زندگی کا بہت سا کام اپنی تکمیل تک پہنچ گیا میں اور فرحت اکثر حویلی کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے......اس روز بھی ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک بیمار ادھیڑ عمر عورت بڑے سے صحن کو عبور کرتی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔وہ فضلاں تھی......

فرحت چلائی ......مائی کیا بات ہے باہر جاؤ......باہر کھڑی ہو کر سوال کرو......اندر کیوں آ رہی ہو......

اس نے ہمارے پاؤں چھو کر ماتھے سے لگایا اور رونے لگی ______ ''سائیں آپ نے مجھے پہچانا نہیں......میں فضلاں ہو......انوار بیٹے کی دائی......فرحت اسے دیکھ کر حیران تھی......وہ اپنے بیتے دنوں کا سایہ لگ رہی تھی ______ وقت کی سختی نے اسے بہت بوڑھا کر دیا تھا اس نے انوار کی شادی کی مبارکباد دی اور ایسی باتیں پوچھنے لگی جن

میں وہ حصہ نہیں بتا سکی تھی۔ وہ بولی ______ ''سائیں کو دودھ پلانے کا ______ اور تو خواری ہی تھی سفر ختم نہ ہوا...... ختم ہوگئی اب اپنے حق کی ڈیڑھ گز زمین کا حق مانگنے آئی ہوں...... انوار بیٹے کے صدقے میں سب مرکھپ گئے جو باپی ہیں پہچانتے نہیں لیکن آپ دونوں تو پہچانیں گے۔'' اس کے چہرے پر برسوں کی مسافت کی دھول تھی ______۔

''انوار بیٹا ______ مائی انوار نے تمہارا دودھ ہی تو پیا تھا...... تم نے جنا تو نہیں تھا اسے...... اب برسوں بعد یہ جتانے آئی ہو کہ تم ہی اس کی دائی تھی ______ بھاگی ہوئی عورت ______ لوگ اس پر بھی شک کریں گے...... اب دوبارہ نہ کہنا...... سمجھیں...... جہاں تک رہی قبر کی زمین تو ______ زمین تو سب کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ تمہیں بھی جگہ دے ہی دے گی...... گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اب دوبارہ انوار کو بیٹا نہ کہنا ______ ''پر سائیں اس نے میرا دودھ پیا تھا ______ اس پر میرا کچھ تو حق ہے...... اور بدلہ زیادہ تو نہیں بی بی ______ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی ______ مایوس ناکام اور بے بس میں نے

غور سے اسے دیکھا وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی......اس کے گہری سرخ آنکھیں تپ رہی تھیں وہ شاید موت کے کنارے بیٹھی زندگی کی وسعت سے ڈیڑھ گز زمین کی طالب تھی _____ ہم جو اس کے قرض دار تھے۔ اپنا قرض ادا نہیں کر سکے تھے۔ مجھے لگا جیسے عورتوں کی منڈی میں ہم ہی نے اسے بار بار بیچا ہو۔

''اچھا اچھا جاؤ جا کر باہر بیٹھو اندر مت آنا نہ جانے کہاں کہاں کی بیماریاں سمیٹ کر ساتھ لے آئی ہے۔''فرحت نے منہ پھیر کر حکم دیا _____ وہ دعائیں دینے لگی......ان سب نیکیوں کے اجر کی دعائیں جو ہم کبھی کر نہ سکے تھے پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی باہر چلی گئی۔ شاید اس کا سفر ختم ہو گیا تھا _ _ _ _ _ _ اور اگلی صبح وہ نوکر خانے کی ایک جھنگا چارپائی پر لیٹی لیٹی ہی مر گئی _____ میں چاہتا ہوں کہ اس سارے قصے کو بھول جاؤں......لیکن میں اسے بھول نہیں پاتا نہ جانے کیوں......

دھرتی کا جبر

میرے دروازے کے باہر آسمان نیلاہٹ اندھیرے شفق کی سرخی میں مل کر عجیب پراسرار ماحلو بنا رہی ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے آسمان کی پنہائیں میں چھپی ایک سسکار گونج رہی ہے بڑھ رہی ہے یہ کون غمزدہ ہے۔یہ کیسی سسکار ہے۔یہ کون رورہا ہے۔شاید شام ہواداس اور تنہا شام یہ سسکار ______ کیا یہ میرے اندر سے ابھری ہے......شاید میرے گرد چھائی تنہائی میرے ساتھ مل کر ماتم کناں ہو ______ لیکن میرے گھر کے سامنے پھیلا راستہ اتنا اجاڑ کیوں لگ رہا ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے زمانوں

سے میں ان قدموں کی دھمک کی منتظر ہوں جو کبھی میرے آنگن میں میرے دل میں گونجا کرتے تھے۔ جن جسموں کے لمس میرے جسم کے انگ انگ میں رچے ہوئے تھے۔ وہی لمس آہستہ آہستہ میرے وجود سے ابھر کر مجھے تنہا کرتے جا رہے ہیں۔ یہ کیسا ساتھ ہے۔

میں اداس تو ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن میرے گھر کو آتا راستہ اداس ہے۔ میرے دل کو آتا راستہ اداس ہے _ _ _ _ _ اور وہ پانچوں _____ وہ پانچوں جو میری کوکھ سے جنم نہ لے سکے لیکن جن کی محبت کی جڑیں میرے اندر پیوست ہیں۔ کیا میں ان کا انتظار چھوڑ دوں؟ کیا میں اپنے گھر کی طرف آتے راستے میں اڑتی دھول میں ان تمتماتے چہروں کا انتظار چھوڑ دوں؟ میں اپنی بوڑھی آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے دل سے پوچھ رہی ہوں۔

میں یہاں اکیلی ہوں اپنے دروازے کے باہر پھیلی دھرتی کی مانند جس کی کوکھ نے لاکھوں دانوں کو جنم دیا ہے لیکن جو اس ملگجے اندھیرے میں اداس اور غمزدہ لگ رہی ہے _____ بالکل میری طرح _____

دھرتی اور عورت ______ دھرتی اور ماں ______

''ماں'' جو عورت کی تکمیل کی انتہا ہے۔

ماں جو خالق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی ہے کیا میں ماں ہوں؟ کیا میں دھرتی ہوں؟ کوئی آہٹ نہیں۔

میرا بوڑھا ذہن الجھ گیا ہے۔ مٹیالے سے غبار نے کھیتوں کی اداسی کو ڈھانپ دیا ہے باہر اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔ لامتناہی اندھیرا اور میرے دروازے تک آئی پگڈنڈی سونی ہے _ _ _ _ _ _ کوئی آہٹ نہیں...... کسی دور جاتے یا نزدیک آتے قدموں کی دھمک ______ نہیں کچھ نہیں ______ اندھیرا اور مایوسی۔

لیکن میں مایوس تو نہیں ہوں میرے دل کے اندر شاید کہیں بہت دور خوشی کی ننھی سی کرن ابھی بھی روشن ہے اور میری بوڑھی گردن میں ان پانچوں کے بازوؤں کی گرفت زندہ ہے۔ میں تنہا کیوں رہوں میرے بوڑھے لب مسکرا رہے ہیں وہ پانچوں جونوراں کے بیٹے ہیں وہ پانچوں جو جانوں کے بیٹے ہیں میں مطمئن ہوں اور میں اب آنکھیں موند کر موت کے

تصور کر سکتی ہوں۔ میں نے اپنے خوابوں کی تکمیل کر لی ہے۔

اپنے چہرے پر پھیلی ان لاتعداد جھرڑوں کو محسوس کرنے کے لیے میں نے اپنے لرزاں ہاتھوں کو منہ پر پھیرا ہے میرے ہاتھوں کی پوروں نے ایک اور ہی چہرے کو چھو لیا ہے وہ چہرہ یہ چہرہ تو نہیں وہ چہرہ کس کا ہے میں یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

وہ چہرہ ______ ارے یہ تو میرا ہی چہرہ ہے اور اس پر پیپل کے تازہ نکلے ہوئے پتے کی لالی ہے میں جانوں کے ساتھ کھڑی ہوں اور میے سامنے میرے کھیتوں کی ہریالیاں پھیلی ہوئی ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میں ہوا میں تیرتی ہوئی جانوں کے ساتھ کھڑی اس ہریاول کے اوپر چھا رہی ہوں۔ میرے انگ انگ میں ایک نشہ سا ہے ______ اپنے کھیتوں کی ہریاول کا نشہ

میں نے جانوں کی طرف دیکھا ہے وہ اداس ہے لیکن اپنی خوشی کی دھند سے مجھے اس کی اداسی نظر نہیں آتی۔

"جان محمد یہ دھرتی کتنی عظیم ہے یہ اپنے اندر کتنی خوبصورتیوں کو

چھپائے رہتی ہے اور جب یہ خوبصورتیاں ابھرتی ہیں سطح پر آتی ہیں تو انسان خوشیوں سے پاگل ہو جاتا ہے۔'' میں نے اپنی فصلوں کو مونگیا سائے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

اور جانوں نے میری طرف عجیب اداس آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی سیاہ ڈانگ کو زور سے زمین پر مارا تھا اور میں جو چند لمحے پہلے خوشیوں کے ہنڈولے میں بیٹھی بہت اونچا اڑ رہی تھی ایک دم زمین پر گر گئی تھی...... میں جانتی ہوں جانوں کیوں اداس ہے اور میں جو عورت ہونے کے ناطے تخلیق کر کے خالق بن سکتی ہوں اس منزل کو ابھی تک پا نہیں سکی۔

دھرتی اور عورت دونوں تخلیق کے لیے ہی تو بنائی گئی ہیں میرے سامنے دھرتی پھیلی ہوئی ہے جس کے بے کنار سنہرے کے اوپر آسمان کی نیلی چنری پھیلی ہوئی ہے اور دھوپ کا سونا نئی نویلی کونپلوں کے اوپر تیر رہا ہے۔

دھرتی اور عورت دونوں ہی مرد کا جبر سہہ کر مسکراتی ہیں۔دونوں ہی پھلتی پھولتی ہیں اور یہی ان کی خوبصورتی ہے ______ لیکن میں تو کچھ

بھی نہیں ہوں اپنی محرومیوں کا سوچ کر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں میں تو ایسی بانجھ دھرتی ہوں جو سینچے جانے پر بھی خوبصورتی کو جنم نہیں دے سکتی۔

جانوں اداس ہے میں اداس ہوں ______ اور دھرتی کا سونا دھوپ کی تمازت میں اور بھی نکھرتا جا رہا ہے ______ میں چپ چاپ بیٹھ گئی ہوں اور میں نے اپنے ہاتھوں میں زرخیز دھرتی کی خاک کو سمیٹ لیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو پلو سے پونچھتے ہوئے خاک کو آہستہ آہستہ نیچے گرا دیا ہے...... جیسے یہ دھرتی کی خاک نہیں بلکہ میرا اپنا وجود ہو جو گر رہا ہو۔

"جانوں میں جانتی ہوں تم اداس ہو لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔" میں نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ بھی میرے پاس بیٹھ گیا ہے......

"میں تم کو الزام نہیں دیتا کرم بی بی ______ یہ تو میرا اپنا مقدار ہے بھلا اس میں تمہارا اور میرا کیا دوش ______ لیکن میں سوچتا ہوں کتنا اچھا ہوتا اگر ہمارے اپنے بیٹے اس کی باگوں کو تھامتے اور میں کنارے

پر بیٹھا ان کے قدموں کی دھمک سن کر دل ہی دل میں مسکراتا۔''

''جانوں میں مایوس نہیں ہوں۔''

اور کرم بی بی میں کب آس توڑے بیٹھا ہوں لیکن کرم بی بی عورت کا بانجھ پن اور دھرتی کا بانجھ پن دونوں ہی مردوں کو سوچوں میں ڈبو دیتے ہیں ______ اور کرم بی بی میں تو مایوسی کے بھنور میں ڈوب ڈوب کر ابھرتا ہوں اور ابھرا ابھرا کر ڈوب جاتا ہوں...... تم برا نہ ماننا۔''

اور میرے دل میں انجانے اور جان لیوا وسوسے سر اُٹھا رہے تھے۔'' ابھی آٹھ ہی تو سال ہوئے ہیں، آٹھ صدیاں تو نہیں گزریں ______ اور جانوں مایوس ہے ______ میں بھی تو مایوس ہوں، لیکن اپنا دکھ چھپا رہی ہوں۔ عورت کی کُل کائنات ہے ہی کتنی۔ مرد کی ذات کا احاطہ کرتا ہوا چھوٹا سا دائرہ اور بس اور اگر اس دائرے کی کھینچی ہوئی لکیر مٹ گئی تو...... نہیں میں آگے نہیں سوچوں گی۔ مجھے جانوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لینا چاہیے میں نے اسکا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ جان محمد مسکرا رہا تھا۔ وہ میرے اندر اُٹھے خیالوں کو سمجھ گیا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ تھامے کھڑے تھے

ـ

"پگلی ڈر رہی ہو۔ بھلا اس سے میری اپنی قسمت بدل جائے گی ۔خدا کو ایسا ہی منظور ہے۔ پھر تم سے کیا گلہ۔" اس نے ڈانٹ کر اُٹھایا اور کھیتوں میں جاتی پگڈنڈی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بغیر مڑے آگے بڑھ رہا تھا ۔میں نے اُٹھ کر اپنے کپڑوں کو جھاڑا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے زمین کی محبت اور جانوں کی محبت اور زمین کی محبت لہر در لہر میرے اندر داخل ہو کر مجھے سمندر کی طرح وسیع اور بیکراں بنا رہی ہے اور ننھے ننھے قہقہوں کی آواز میرے اندر سے اُٹھ کر سب طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ ننھے ننھے ہاتھ میرا ہاتھ پکڑے مجھے اوپر ہی اوپر اُڑائے لیے جا رہے ہیں۔ وسعتوں کی طرف، نیلاہٹوں کی طرف۔"

اور آج جب بھی میں اکیلی کوٹھڑی میں بیٹھی ہوں۔ جانوں کو ہاتھوں کی گرفت میرے ہاتھوں پر محسوس ہو رہی ہے اور یہی گرفت کا احساس تو ہے جس نے مجھے حیات کی گھور اندھیری اور اکیلی راتوں میں بھی اکیلا نہیں ہونے دیا اور اب میں سوچتی ہوں وہ احساس میرا اپنا ہی تو پیدا کیا ہوا

ہے۔اس میں جانوں کے حصے کا کتنا سچ شامل تھا۔میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔میں تو اپنے اندر کے سچ اور اپنے حصے کی سچائی سے ہی خوش ہوتی رہتی تھی۔میرے پاس اب رہا ہی کیا ہے۔میرے دل کے اندر چھپے ان خوشیوں کے سائے جو میرے دل کو ٹھنڈا یخ کر دیتے ہیں۔اب پانچوں قدموں کی مدھم گونج میرے اندر گونجتی رہتی ہے ______ اور دھرتی جو میری دہلیز سے باہر دور تک پھیلی ہوئی ہے ______ دھرتی، جس کی نرم محبت کی پھوار میرے دل کو اب بھی بھگوتی رہتی ہے۔

میں اپنے دہلیز پر کھڑی رات کی سیاہی کو کھیتوں کے مونگیا اندھیرے میں گھلتا دیکھ رہی ہوں ______ سن سن ______ سن ______ یہ کون ہے؟ یہ کس کے قدم کی چاپ راہ کی اداسی میں گھل رہی ہے؟ شائد یہ ہوا ہے جو دھان کے بوجھ سے جھکی بالیوں میں الجھ گئی ہے۔شیر جان کیا یہ تم ہو ______ ضمیر جان ______ فیض جان ______ کیا تم بھی اپنی بوڑھی ماں کو دیکھنے آئے ہو۔کوئی بھی نہیں۔لیکن یہ کیسی آواز ہے جو مجھے گھیرے رہتی ہے تمام اداسیوں اور دکھوں کو سمیٹتی ہوئی۔وہ پانچ چھتنار

درخت جو میری آس کے آنگن میں اُگ آئے تھے۔ جانوں کے بیٹے جن کو میں نے اپنی محبت سے سیراب کیا تھا۔ دھرتی کی اور جانوں کے بیٹے کی محبت میرے اندر خوشبو بن کر دوڑ رہی ہے اور گزرتے وقت کی باس یادوں کے بوجھل پاؤں سے بندھی چھن چھن کرتی میرے گرد ناچ رہی ہے اور میرے بوڑھے ہاتھ ان یادوں کو گرفت میں لینے کے لیے لرز رہے ہیں۔

کیا میں نے زندگی کی ساری راہ عبور کر لی؟ میں کس سے پوچھوں؟ میری کوٹھڑی کے اوپر آسمان کی سیاہ نیلاہٹ ہی تو ہے اور جانوں کو بچھڑے زمانے ہی تو ہو گئے ہیں ______ کس قدر تھک گئی ہوں ______ لیکن میرا دل ویران تو نہیں ______ کیا میں اس دھرتی کی ماں نہیں۔ میں نے ہی تو اس ہریاول کو جنم دیا ہے۔

مند مند ہوا کھیتوں کے اوپر بہتی انہیں لہر در لہر ہچکولے دے رہی تھی اور میں اپنے جوان بازوؤں کو ساری وسعت میں پھیلا کر اُس خوشی کو سمیٹ لینا چاہتی تھی جو اس وقت میرے چاروں طرف بکھری پڑی تھیں۔ لیکن میں ان لہر در لہر سبزے کا ایک حصہ بن جانا چاہتی تھی۔ نیلے آسمان پر طوطوں کا

جھنڈ ٹائیں ٹائیں کرتا تیزی سے مغرب کی طرف اُڑتا جا رہا تھا۔ میں غلیل ہاتھ میں لیے کووں اور چڑیوں کو اُڑانے کے لیے اونچی سی مچان پر بیٹھی تھی کیونکہ جانوں گاؤں سے ٹوٹے ہل کو مرمت کروانے گیا ہوا تھا اور میں وہاں اس بے کنار ہریاول میں گھری انوکھی سی خوشی سے سرشار ہوگئی تھی۔ دھرتی کی چاہت سورج کی کرن بن کر میرے دل میں اُتر گئی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ماہیا کے بول اپنی پوری آواز میں گاؤں ______ پھر نہ جانے کیسے اُس ساری خوبصورتی اور بھرپور طمانیت کے اندر سے ایک ڈر اور خوف ابھر کر مجھے ڈرانے لگا اور مجھے لگا تھا کہ میں اس وقت بانجھ دھرتی کی مانند خاک خاک اور اُجاڑ ہوگئی ہوں۔ کووں کے جھنڈ سیاہ دھبوں کی مانند سورج کے بڑے سے آتشی گولے کے سامنے سے گزر رہے تھے اور طوطے آوازیں پیدا کرتے کھیتوں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ وہ سب جو بنجر پن اور ویرانی کا مطلب نہیں جان سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اکائی میں بھی پھیل سکتے تھے اور ______ تخلیق کر سکتے تھے ______ بٹ سکتے تھے ______ میں ______ میں کیا تھی، اس تمام ہریاول اور زندگی کے درمیان گھری

ہوئی ایک بے آب و گیاہ ٹکڑا...... میں کچھ تخلیق نہیں کر سکتی تھی ...... کیوں؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں اس آبِ حیات سے کیوں محروم رہی؟ ایک اُمید کا اَن دیکھا ہاتھ مجھے تھام رکھا تھا لیکن آہستہ آہستہ اَن دیکھا ہاتھ کہیں مایوسی کی لہر میں گم ہو گیا تھا اور میں جانوں کو بتائے بغیر خوف اور مایوسی کے سیاہ اندھیرے میں گر چکی تھی ــــــــ میں جانوں کو کس بھروسے اس میں شریک کرتی ...... اور امید اور آس ٹوٹ جانے پر میں ایسا ہی تو محسوس کرنے لگی تھی، جیسے میں تند لہروں میں گھِری ڈوبتی رہتی ہوں۔ اکیلی ہی ــــــــ اور اس وقت تک میرے گرد زندگی کے ان مٹ نقوش بکھرے ہوئے تھے۔ میں پھر خوف اور مایوسی میں گھِر گئی تھی۔ یہ دھرتی میری نہیں ہو سکتی تھی ...... یہ دھرتی مجھے چھوڑ بھی سکتی ہے اور اس پہ سارا سبزہ دوسروں کے قبضے میں جا سکتا ہے ــــــــ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے مچان پر کھڑے ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ "جانوں ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ وہ کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟ میں وہاں اکیلی ہی تو کھڑی تھی۔ جیسے زندگی اور زمین نے اُٹھا کر مجھے اپنے سے باہر نکال دیا ہو۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں ــــــــ میں

اس زمین کی مالک رہنا چاہتی ہوں۔میں جانوں کی مالک رہنا چاہتی ہوں

۔''میں زور سے بولی_______خوف کی ایک نئی جان لیوا لہر میرے اندر

سے اُٹھ رہی تھی ......میں اکیلی کیوں ہوں ؟......میرے بچے کہاں ہیں

؟میرے کانوں میں شادیوں کے ڈھول بجتے جوان کی شادی پر گونجنے والے

تھے۔''اور تب میں نے سیاہ بھینسوں کو اپنے کھیت روندتے ہوئے دیکھا۔یہ

کس کے جانور ہیں۔میں نے سوچا۔میرے اپنے جانور تو میرے گھر کے

پچھواڑے بندھے ہوئے تھے اور میں نے ان کے آگے چارہ ڈال دیا تھا

۔میں نے ان کی گردن کو پیار سے تھپتھپایا تھا______مجھے غصہ آرہا تھا

''ہے______ہے______ہے______

______''میں زور سے چلائی۔ارے کون ہے جو اپنے جانورں کو نہیں

روکتا؟نکالو انہیں۔فصل برباد ہو رہی ہے۔''میں مچان سے اُتر کر ان کی

طرف بھاگی۔

''چاچی یہ اپنے ہی جانور ہیں۔'' جانوں کا بھتیجا فضل ہنس کر بولا

______''شائد بھوکے ہیں۔میں نے سوچا اپنا چاچا بھلا کیا کہے گا

۔ذرا منہ مار لیں ______ پیٹ بھر جائے گا۔'' فضل لا پرواہی سے ڈانگ کندھے پر رکھے میرے برابر آ کر کھڑا ہو گیا اور جانور کھیت کے اندر بڑھتے جا رہے تھے۔

''فضل جیتے جی تم ان کھیتوں کو برباد نہیں کر سکتے۔میں اور جانوں زندہ ہیں۔نکال لے جاؤ ان کو ______ ''میں نی جانوروں کو کھیت کے کنارے کی طرف ہنکاتے ہوئے غصے سے کہا تھا۔''میں نا اُمید نہیں ہوں ۔خدا بھی جاگتا ہے۔دعائیں سنتا ہے۔میں مایوسی کو دباتے ہوئے بولی۔'' چاچی ،تم ان کھیتوں کے پیچھے ناحق اپنی جان ہلکان کرتی ہو۔بڑی لالچی ہو ۔تمہارے کون سے بیٹے بیٹھے ہیں یا داماد ہوں گے جو ان کے وارث بنیں گے۔آج نہ سہی کل سہی آخر تو ہمارے ہی تو ہیں۔پھر آج ہی سہی۔'' وہ میرے سامنے کھڑا ہنس رہا تھا۔اس نے دور تک پھیلی ہوئی فصلوں کو للچائی نظروں سے دیکھا اور آہستہ آہستہ قدم دھرتا جانوروں کے پیچھے چل پڑا ۔لیکن کنارے پر کھڑا ہو کر بولا۔'' چاچی کوئی بات نہیں۔ایک روز میں سارے جانور ان کھیتوں پر چھوڑ دوں گا۔اور تم کچھ نہ کر سکو

گی ______ وہ زور سے ہنسا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا آگے چل پڑا۔ اور میں وہاں اس کی طنز پر ہنسی سے زخمی کھڑی تھی ______ سیاہی مائل سرخ لکیر افق کے کنارے پر مدھم ہوتی جارہی تھی۔ اس وقت وہاں اتنی ویرانی تھی جیسے وہاں سوائے میرے اور سیاہی کے کوئی نہ ہو ______ اور پھر میرا ناطہ دنیا کے ساتھ کچھ نہ ہو ______ اور میں ماتم کر رہی تھی ان بیٹوں کا جو جنم نہ لے سکے۔ جو اس دھرتی پر ہل نہ چلا سکے۔ میں ماتم کر رہی تھی ان خوشیوں کا جو میرے آنگن میں ناچ نہ سکیں اور میں نے برسوں کے بعد پہلی بار اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ وقت کی جھریوں سے مرجھایا ہوا میرا ہاتھ......تو اتنا زمانہ گزر گیا کوئی سایہ نہیں جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر سکھ کا سانس لے سکوں۔ جانوں سانس لے سکے ہمارے بچے کہاں ہیں؟ کہاں ہیں میرے پوتے جنہوں نے میری گود میں کھیلنا ہے؟ جانوں واپس نہیں آیا تھا۔ اور میں اترتی رات میں اکیلی کھڑی تھی۔ میرے پاس سے بہتی کھیت کی نالی کا پانی مدھم کل کل کر کے آگے بہتا جارہا تھا......اور میں ڈراتی ہوئی سوچوں اور وسوسوں میں گھری خاموش تھی۔ نہیں یہ کھیت میرے ہیں۔ یہ کھیت جانوں کے بچوں

کے ہیں، لیکن کون سے بچے؟ اور میں نے پہلی بار اس حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا اور پہلی بار میں نے اپنی خود غرضی سے نفرت کی تھی۔ میں کتنی خود غرض ہوں ______ میں اپنے ساتھ جانوں کا بڑھاپا بھی رسوا کرنا چاہتی ہوں۔

اور مجھے لگا جیسے اندھیرے سے ہمک کر دھرتی میری طرف بڑھ رہی ہو۔ جیسے یہ دھرتی میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہو۔ جانوں سے بھی پیاری۔ اپنی زندگی کی عافیت اور خوشیوں سے بھی پیاری۔ میں بے بسی سے رو پڑی تھی ______ میں تڑپ رہی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس پر ٹکا دیئے تھے۔ میں اس پر جھک کر اس سے چمٹ گئی تھی، میں اس میں سمانا چاہتی تھی۔

اور وہاں اس تنہائی میں گھری میں جان گئی تھی کہ فیصلے کا وہ لمحہ آن پہنچا ہے جو میری کائنات کو تقسیم کر دے گا۔ یہ فیصلے کا لمحہ ہمیشہ سے میرا پیچھا کرتا رہا تھا اور میں نے اس سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس زمین پر کوئی اور مالک نہیں ہوگا۔ جانوں کے بیٹے ہی اس کے وارث ہوں گے چاہے وہ

میرے بیٹے نہ ہوں۔ وہ لمحہ آج فضل کے ساتھ ہی آیا تھا اور میں تو ہمیشہ سے اس لمحے سے مغلوب ہونے کے لیے پیدا ہوئی تھی اور پھر مجھے لگا جیسے میرے اندر سے کوئی چیز کٹ کر کہیں گم ہوگئی ہے بے بسی اور ویرانی۔ اور کونپل کونپل چمکتے جگنوؤں کی بارات میں گھِری میں نے اپنے آپ کو خود ہی کاٹ ڈالا ہے۔ مجھے فضل کی آنکھوں میں چمکتی خود غرضی کی روشنی کو بجھانا ہی ہوگا، لیکن میں جانوں کے بیٹے کو ہی اس زمین کا وارث بناؤں گی اور پھر ہمارے شریک میرے بانجھ پن پر خوش نہ ہوسکیں گے۔ انہیں دوسروں کی ویرانیوں پر خوشیوں کا حق نہیں ہے۔

جانوں نہیں آیا تھا اور رات کی سیاہی جگنوؤں کی روشنی میں میرا مذاق ارا رہی تھی۔ شائد زمین کی محبت مرد کی محبت پر غالب آگئی تھی ______ دھرتی اور عورت ______ ہاں ہمارا ناطہ تھا ______ اور یہ ناطہ ٹوٹ نہیں سکتا...... زمین کی محبت تو پشتوں سے میرے اندر داخل ہوچکی تھی۔ میں دھرتی کی بیٹی تھی۔ اس کا میرا ناطہ اٹوٹ تھا۔ پکا تھا۔

میں کنارے کنارے چلتی اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔ دِیا مدھم لو

سے جل رہا تھا۔میں نے تاک میں پڑے آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی ۔لیکن آئینہ بہت دھندلا تھا یا شائد میں رو رہی تھی ......میں کیوں دھرتی نہ بن سکی۔ میں کیوں پھل پھول نہ سکی۔

جانوں نے ہل کو باڑے میں رکھا اور میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا ۔وہ مجھے ایک دَم بوڑھا اور اداس نظر آ رہا تھا......دُکھ اور مایوسی۔

''کیوں کرم بی بی تمہارا چہرہ سرسوں کی طرح پیلا کیوں نظر آ رہا ہے ؟''اس نے دِیے کی لَو کو اور زیادہ اونچا کرتے ہوئے پوچھا تھا۔میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، میرے اندر اُٹھتا ہوا سوچوں کا طوفان اندھیر مچا رہا تھا ۔میں نے باہر آ کر جگنوؤں کے چراغاں میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تھی ۔اس کے بال سفید ہو رہے تھے اور اس کا چہرہ وقت کی دھول اس اندھیرے میں اور بھی صاف نظر آ رہی تھی۔

ایک ساعت مجھے لگا کہ میں جانوں کی محبت کو بانٹ نہ سکوں گی ۔مرد کی محبت بڑی جابر ہوتی ہے۔وہ ہمارے خون کا آخری قطرہ نچوڑ کر بھی دل سے الگ نہیں ہوتی ......لیکن اس وقت میں دھرتی کے جبر کا شکار تھی

۔زمین میرے اندر کی ساری محبتوں کو مٹا کو اپنی ذات کو گھیر رہی تھی ۔مٹا رہی تھی۔

’’کرم بی بی آؤ اندر چلو۔دیکھو باہر کتنی خنکی ہے۔‘‘ جانوں حیران ہو کر مجھے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔وہ بار بار میرے چہرے کی طرف سیکھ رہا تھا

۔

’’جان محمد آج تمہارے بھتیجے کے جانور میری فصلوں کو روند رہے تھے۔‘‘میں نے اپنے آنسوؤں کو پلو سے پونچھ ک رکہا۔

جانوں نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ سے کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔میں جانتی تھی وہ میرے اندر بھرے رنج اور غصے کو سمجھتا تھا ۔اس نے اپنی مایوسی اور دکھ کو مجھ سے چھپا رکھا تھا ،لیکن میں جانتی تھی ۔دھان کی تیز اور بوجھل باس ہم دونوں کے چاروں طرف بھر رہی تھی ۔مانوس اور اپنی سی _______ دل کے اندر اُتر کر طمانیت اور خوشی بخشنے والی خوشبو۔وہ خاموش بیٹھا تھا۔

’’جانوں تم بولتے کیوں نہیں؟‘‘ اس وقت مجھے لگا جیسے جانوں مجھ

سے دور ہو گیا ہو یا میری اپنی ہی سوچیں دور ہو رہی تھیں۔

"کرم بی بی میں کیا کہوں ...... آخر کو تو یہ کھیت ان کے پاس ہی جائیں گے۔ ہمارا کون ہے؟"

"نہیں جان محمد ایسا نہیں ہو گا۔ یہ کھیت تمہارے بیٹوں کے ہیں۔ اس دھرتی کو تمہارے بیٹے سینچیں گے۔ تمہارے بیٹے۔"

"میرے بیٹے؟" جان محمد نے ہنس کر پوچھا تھا۔ اس کے اندر چھپی مایوسی کو میں جانتی تھی۔

"جان محمد تمہارے وہ بیٹے جن کو تمہاری دوسری بیوی جنم دے گی۔ جو تمہارا خون ہوں گے۔ تمہاری زمینوں کے وارث ہوں گے۔ جو تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر گاؤں کی گلیوں میں چلیں گے۔ جن کو دیکھ کر لوگ کہیں گے ______ دیکھو تو جانوں کے بیٹے کتنے خوبصورت ہیں جوان ہیں اور پھر ان کے بچے ہوں گے۔ تمہارا نام نہیں مرے گا جان محمد اور تمہارے نام سے میرا نام زندہ ہو گا۔ اس کی آواز بے جان تھی۔

"ہاں میں سپنوں میں بہت دور چلی گئی ہوں...... تمہارے بیٹوں

کے قدموں کی دھمک اپنے دل کے اندر سن رہی ہوں۔ اپنے آنگن میں سن رہی ہوں۔ اپنے کھیتوں کی منڈیروں پر سن رہی ہوں۔ اور جان محمد وہ پورے پانچ ہیں۔ میرے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پورے پانچ۔'' میں نے اپنی ہتھیلی کو اس کے سامنے اندھیرے میں پھیلا دیا؛ حالانکہ ہمیں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جانوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا، لیکن میرا سارا وجود تپ رہا تھا۔ شدید خواہش اور خواب نے میرے سارے اندر آگ بھڑک دی تھی۔ مجھے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ جوان اور بھرپور قہقہے۔ ننھے بچوں کے رونے کی مدھر آوازیں۔ میرا ویران دل پہلی بار خوبصورتوں کی سوچوں سے بھر گیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے دس کڑیل بازو میرے چاروں طرف پھیلے مجھے اُٹھا کر اوپر ہی اوپر اُڑا رہے ہوں۔ میں ہولے ہولے ہنس رہی تھی۔ جیسے میں نے انہیں سچ مچ جنم دے ڈالا ہو......''

کرم بی بی ہوش کرو۔'' اس نے مجھے زبردستی اٹھائے ہوئے کہا۔ ''چلو اندر چلیں...... دھان کی باس بعض دفعہ سر میں گھس جاتی ہے۔''

''جانوں آج پہلی بار میں خود غرضی کے جال میں نکلی ہوں۔ تمہاری

ساری محبت کو سمیٹ لینے کے جال سے نکلی ہوں۔ میں بھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے بیٹوں کے نام ہیں۔ خواہ وہ میرے نہ ہوں......" کرم بی بی تم فکر نہ کرو۔ میں خوش ہوں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا، کون ہماری زمینوں پر ہل چلائے گا۔ کون ان پر جانور چھوڑے گا، مجھے اس کی فکر نہیں

اُٹھو سپنے مت دیکھو۔" ______ چلو اندر چلیں ______

"لیکن جانوں یہ دھرتی میرا سہاگ ہے......تمہاری محبت بھی اس کے سامنے ہلکی پڑ جاتی ہے۔ جانتے ہو میں عورت ہوں اور عورت اپنی دھرتی اور مرد نہیں بانٹ سکتی، لیکن جانوں دھرتی صرف اسی طرح قائم رہ سکتی ہے۔ اگر میں تمہیں بانٹ لوں۔ اُس اَن دیکھی سُوت کے ساتھ جو تمہاری بیوی بنے گی۔ اور جانوں کیا خبر میرا یہ فیصلہ تمہاری ہی محبت ہو۔ اس زمین کو تمہارے ہی بیٹے کیوں نہ سینچیں۔ وہ تمہارا سہارا ہوں گے۔ وہ میرا سہارا ہوں گے۔"

"کرم بی بی، تم نہ جانے کیسی سوچوں میں ڈوب گئی ہو۔ تم یہ سب سہار لوگی...... میں تم کو دکھ نہیں دے سکتا کرم بی بی۔ پھر خواہ مخواہ سوچنے سے

فائدہ...... قسمت نہیں بدل سکتی......"

"جان محمد عورت کی محبت امر بیل کی مانند ہوتی ہے، جو درخت کا سارا رس چوس کر ہی زندہ رہ سکتی ہے، لیکن میں نے اس کی جڑوں کو نوچ کر پھینک دینے کا فیصلہ کو لیا ہے۔ تم کچھ مت بولو جان محمد۔ تم کچھ مت کہو۔ تم نہیں سمجھ سکتے......"

"چپ ہو جاؤ کرم بی بی۔ چلو اندر دھان کی باس تمہارے دماغ میں گھس کو اُسے ورغلا رہی ہے۔ اب اُٹھ بھی جاؤ......"

ہم دونوں اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ دِیا مدہم بات کے ساتھ جل رہا تھا اور ہم دونوں کے سائے آپس میں گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ ہوا ہولے ہولے اندر سے گھوم کر باہر جاتی اور پھر اندر آتی۔ دروازے کے نیم واپٹ سے نظر آتا جگنوؤں کا میلہ ابھی تک روشن کر رہے تھے۔ آخری دنوں کا چاند کریر کے چھدرے درخت سے ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر میں اور جانوں بیٹھے رہے تھے۔ تنہائی کا آنے والا تصور میرے خواب کو بکھیرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن میں اپنی ساری سوچوں اور طاقت کے ساتھ اُسے

جوڑنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور نیا سورج کھیتوں کے پرلے طرف سے ابھرے گا۔ لالی کی ہلکی لکیر ما نگیا اندھیروں سے اُبھرے گی اور پھر باقی دنوں سے الگ ایک دن نکلے گا۔

”ہاں۔ آج مجھے ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ تنہا ہی جانوں کے بغیر۔“ جانوں جانوروں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ ساری کائنات پر ایک گہرا سکوت چھایا لگ رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مند مند خشک ہوا کھیتوں کی ہریالی پر تیر رہی تھی۔ میں اندر کوٹھڑی میں دہی کی چاٹی کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ وہ میرا تھا گھر میرا گھر____

نئی رنگین چارپائی پر میں نے جان محمد کی نئی اور جوان دلہن کو بیٹھا دیا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ اندر لالٹین کی روشنی میں اُس کی نتھ چمک رہی تھی۔ وہی نتھ جو کبھی برسوں پہلے میری ناک میں جھول رہی تھی۔ میں نے اپنے سر کی چادر کو الگ کر کے رکھ دیا اور کوٹھڑی کے درمیان کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے پھر دلہن کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے مجھے لگا تھا جیسے وہ نوراں نہ ہو بلکہ میں خود ہوں۔ دھڑکتے دل کے ساتھ جانوں کی منتظر ہوں۔ میں نے

آگے بڑھ کر جھک کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا۔ اس کا چہرہ اور جھک گیا۔" وہ نو خیز کونپل کی مانند ہے اور جانوں نے زندگی کا ایک لمبا راہ طے کر لیا ہے۔" میں نے سوچا۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی ...... لیکن کیا ...... میرا دل دکھ اور خوف سے بھرا ہوا تھا، لیکن میں جانتی تھی۔ میں نے واپس مڑنے کی ساری راہیں کس قدر مضبوطی سے بند کر دی ہیں۔ میں اور جانوں لیکن دھرتی کی چاہت بڑی قربانیاں مانگتی ہیں ...... میں نے اس کا گھونگھٹ چھوڑ دیا اور جب میں سیدھی ہونے لگی تو مجھے لگا جیسے میں بوڑھی ہو چکی ہوں ...... بہت بوڑھی ...... میں پھر اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں تھی ۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔" وہ بیٹی۔ زمین کی اور مرد کی محبت بڑی جابر ہوتی ہے۔ وہ ہم سے ہمارا سب کچھ مانگتی ہے۔ اور اس کے بدلے مَیں تم سے بیٹے مانگتی ہوں۔ تمہارے بیٹے۔ جانوں کے بیٹے۔ تا کہ وہ جانوں کی زمینوں کے وارث بن سکیں۔ تا کہ میں اپنے شریکوں کو مایوس کر سکوں۔ میں تم کو کبھی دھوکا نہیں دوں گی اور تم بھی میرے ساتھ کوئی دھوکا نہ کرنا ...... مجھے زمینوں کے وارث چاہئیں۔" مجھے اور کیا کہنا تھا۔ بولتے

بولتے مجھے لگا۔ جیسے میری زبان خشک ہو کر میرے منہ پر اکڑ گئی ہو......اور میرا دامن جس میں مَیں نے زندگی کے اثاثے کو باندھ رکھا تھا خالی میرے پاؤں میں جھوم رہا تھا......میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔ جانوں نہ جانے کہاں تھا۔ وہ اندر اپنی دلہن کو دیکھنے کیوں نہیں آیا......یہ کیا سوچ گی......میں نے زندگی کے ساتھ ایک سودا کیا ہے۔ اب پچھتانے کا وقت بھی کہاں ہے۔" میں آنگن میں نکل آئی اور میں نے دیکھا جانوں حقے کی نے کو ہاتھ میں پکڑے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم کھڑا ہو گیا......وہ ہنس رہا تھا......میں جانتی تھی وہ مجھے روکنا چاہتا تھا۔ لیکن میری اپنی اَنا فضل جیت نہیں سکتا۔ میرے شریک جیت نہیں سکتے۔ میرا خوف جیت نہیں سکتا۔

"جان محمد اندر آ جاؤ۔ وہ ہٹی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔" میں نے زور زور سے کش لیتے ہوئے کہا تھا۔

"کرم بی بی تم خوابوں میں بہت دور چلی گئی ہو......میں بے قصور ہوں......نہ جانے تم کیا کر رہی ہو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ مجھے تم نے کھلونا بنا رکھا ہے"......جاؤ اندر جاؤ جان محمد......وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتا اندر چلا

گیا تھا......اور میں اپنے دونوں ہاتھوں پر سر رکھ لیا ہے۔میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔پھر میں نے زور زور سے کش لینے شروع کر دیئے ہیں۔تنہائی کے تصور کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہتی تھی۔میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔سیاہ آسمان پر تاروں کا جال تھا۔جھم جھم کرتے انگارے، تپتے ہوئے شعلے......لیکن وہ پھیلے ہوئے تھے جال لی مانند......اور میرے گھر سے باہر میری دھرتی پر بھی لہلہاتی کونپلوں کا جال بچھا تھا......اور وہ بھی دھڑک رہی ہوگی۔میرے دل کی مانند۔تیز تیز......انوکھی خوشی سے......میرے دکھ سے بے خبر......میرے خوابوں کا ساتھ دیتی ہوئی۔سن اے آسمان پر پھوٹتی لالی۔ہر روز نئی کرنیں تمہارے وجود سے جنم لیتی ہیں۔میں بھی بڑھنا چاہتی ہوں،تا کہ دوسرے مجھے ٹنڈ منڈ جان کر کاٹ نہ دیں۔میں جانوں کے بیچ میں جینا چاہتی ہوں۔رات گزرتی جارہی تھی۔راتیں گزر رہی تھیں۔

اور صبح جب میں نے گاؤں میں جا کر بتاشے بانٹنے تھے تو عورتیں مرد مجھے اس طرح حیران ہو کر دیکھ رہے تھے جیسے میں حواس میں نہیں ہوں۔عورتوں نے کہا تھا۔"وہ جوان عورت تجھے گھر سے نکال باہر کرے گی

’’......اور میں نے تمام باتوں کو ہٹاتے ہوئے سوچا تھا۔ جوان خوبصورت اور تندرست عورت...... خوبصورت اور تندرست بچوں کو جنم دے گی۔ اور میں ان کو پالوں گی...... ہم دونوں مل جل کر جان محمد کی تکمیل کرسکیں گے...... میں صرف مسکراتی رہی تھی اور ان کے پیالے سفید سفید بتاشوں سے بھرتی رہی تھی۔ اپنے اندر ابھرے ہوئے خوف کو دباتی ہوئی ہرائی ہوئی۔ اور جب میں نے جان محمد کے پہلے بیٹے کو اپنی گود میں لیا تھا تو میں اپنی راتوں کی تنہائی کو بھول سی گئی تھی۔ جو میں نے سردیوں کی لاانتہا لمبی ساعتوں میں برداشت کی تھی۔ میں دل کے اس درد کو بھی بھول گئی تھی جو اکثر آنسو بن کر میری پلکوں پر چھا جاتا تھا...... دل کا کیا تھا وہ خون خون تو تھا لیکن اس سرخ لیسے ایک نیا پودا جنم لینے والا تھا میں نے گوٹہ لگا دوپٹہ اوڑھا اور برسوں پہلے کا رکھا ہوا جھومر اپنے ماتھے پر سجایا تھا۔ جان محمد نے باہر سے آکر مجھے دیکھا تھا اور میری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا تھا:

’’کرم بی بی، کیا تم خوش ہو؟‘‘ اور میرا دل چاہا تھا میں اس سے بھی یہی سوال کروں لیکن میں نوراں کو دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے ہنس کر

کہا تھا۔ ''جان محمد دیکھو اس کو دیکھو...... کیا یہ تمہارا ہم شکل نہیں لگتا۔'' اور جانوں اپنی پگڑی کے پلو سے آتے آنسو سمیٹ کر کہا تھا: ''کرم بی بی میں شاید تمہیں پوری طرح جانتا نہیں ہوں تم کس مٹی سے بنی ہوئی عورت ہو۔ راتوں کو کئی بار میں نے چاہا کہ تمہارے دل کی بات سننے تمہارے پاس آؤں لیکن تمہاری آنکھوں نے مجھے کوئی بلاوا دینا ہی چھوڑ دیا ہے کیا میں تمہارے دل سے بھی اتر گیا ہوں۔''

میں ہنس دی تھی اور میرا دل تنہا سوچوں سے بھر آیا تھا۔ ''جان محمد میرے پاس اب سوچنے کا وقت نہیں...... نوراں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہ عورت نصیبوں والی ہے اس نے تمہیں بیٹے کا باپ بنا دیا۔ جاؤ اسے مبارکباد دو اس کے پاس جاؤ۔''

''کرم بی بی میں کیا کہوں...... لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا تم نیت و اور بھی مضبوطی سے مجھے ساتھ باندھ لیا ہے میں اگر رہائی پانا بھی چاہوں تو نہیں پا سکوں گا۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر اس نے میر ٹیڑھے جھومر کو سیدھا کرتے ہوئے مجھے دیکھا اور اندر چلا گیا۔ شاید وہ بے حد خوش

تھا...... بیٹے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں......اور میں نے جھک کر اس ننھے سے وجود کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ میرے وجود کا حصہ نہیں تھا لیکن اس میں جانوں کا سارا روپ تھا...... میرا دل انوکھی خوشی اور مامتا سے بھر گیا...... میں ماں تھی دھرتی کا جبر مجھے اس وقت ساری سوچوں سے تہی کر گیا تھا اکیلا پن......اور اپنوں سے بچھڑ جانے کا خوف ...... میری ساری سوچیں تھم گئی تھیں پھر پانچ ننھے وجود میرے آنگن کو بھر گئے تھے یہ خوشیاں میں نے ان گنت راتوں کی تنہائی کے عوض خریدی تھیں سودا سستا نہیں تھا لیکن میں ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

کبھی کبھار جب جانوں کھیتوں سے واپس جلدی آجاتا تو صحن کے پیپل تلے میرے پاس آ بیٹھتا ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور پھر جانوں جھک کر حقے کے کش لینے لگتا......اور میں بھی اپنی نظریں جھکا لیتی ایسا نہ ہو جانوں میری آنکھوں میں تنہائی کے لرزتے سائے دیکھ لے اور میں نوراں سے جھوٹی پڑ جاؤں...... میں ان لمحوں کی رفاقت میں بھی مغموم ہو جاتی تھی......اور وہ دن میری آنکھوں میں آجاتے جب میں اور جانوں الگ

نہیں تھے۔اس وقت میرے لبوں سے ایک آہ نکل جاتی اور جانوں سوچ بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا:

"کرم بی بی اپنے دل کو پتھر مت سمجھو۔کرم بی بی میں تمہارا قرض دار ہوں......میں تم سے شرمندہ ہوں......لیکن میں تمہارے اندر کی آگ کا مداوا نہیں کرسکتا......"

"نہیں جان محمد میں نے تم سے کب گلہ کیا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں کیا یہ سارے وجود میری تنہائی کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔تم کچھ مت سوچو......میں خوش ہوں بے حد خوش......اور تب جان محمد میری طرف دیکھتا اور حقہ پینے لگتا۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ جب کبھی رات کو میری آنکھ کھلتی تو میں چپ چاپ لیٹی خاموشی سے قدموں کی چاپ سننے لگتی اور میرا دل میرے پہلو میں درد کرنے لگتا......"جانوں کیوں خود بخود میرے پاس چلا نہیں آتا؟" لیکن دسروے لمحے میں اس خیال کو زبردستی جھٹک دیتی اور جھک کر اپنے پاس لیٹے بچے کو اپنے ساتھ چمٹا لیتی اور اپنے آپ کو کہتی۔"میں تنہا کب ہوں میں تو

جانوں کے وجود میں شاخ در شاخ پھیل رہی ہوں۔ بڑھ رہی ہوں......اور یہی میری تکمیل ہے جانوں کی تکمیل ہے۔حیات کی تکمیل ہے۔''

وقت گزرتا جا رہا تھا میرے اور جانوں کے بال سفید ہو گئے تھے لیکن ہمارا صحن جوان قدموں کی دھمک سے گونجتا رہتا اور کبھی وہ سارے باہر چلے جاتے تو میں بولائی بولائی سی پھرنے لگتی......اور نوراں سے کہتی ......وہ بیٹی......وہ ابھی تک نہیں آئے......انہیں آ جانا چاہیے تھا۔وہ بھوکے ہوں گے تھک گئے ہوں گے۔''

ایک روز نوراں نے کہا تھا۔''بی بی وہ جوان ہیں تم تو ناحق فکر مند رہتی ہو......تمہیں نہ جانے کیا وہم پڑا رہتا ہے۔آخر کو انہیں تم نے اسی مقصد کے لیے تو خدا سے مانگا تھا۔'' وہ طنز سے ہنس رہی تھی۔

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا......نوراں وہ ابھی بھی جوان تھی......خوبصورت تھی......اور پھر وہ ان کی ماں تھی لیکن وہ طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھی

نوراں خوش نہیں......اس لیے کہ وہ بانجھ پن اور بے اولادی کے

دکھ کی کاٹ کونہیں جانتی وہ اس ویرانی کونہیں جانتی جو عورت کے اندر سے اٹھ کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔وہ خوش کیوں نہیں......اسے خوش ہونا چاہیے۔

میں نے اس کو غور سے دیکھا......وہ بولی۔''بی بی میں تو سوچتی ہوں ان کی پیدائش بھی شاید تم نے ہی کی ہو میں تو ان کی کوئی بھی نہیں لگتی......وہ میرے دامن کو پکڑ کر روٹی کے لیے نہیں کہتے۔وہ باہر سے آ کر سیدھے تمہارے پاس آتے ہیں۔چولہے کے پاس تمہارے پاس ہی تو بیٹھتے ہیں۔میں تو بس ایک مہرہ تھی تاکہ تمہارے خواب پورے کرسکوں میں کیا ہوں صرف ایک بوڑھے آدمی کی بیوی اور بس۔''

میں نے اس کو روکنا چاہا لیکن وہ پھر بولی۔''بی بی مجھے کہنے دو نہیں تو میرا دل پھٹ جائے گا میرا کلیجہ چھلنی ہو جائے گا تم نے میرے شوہر کو مجھ سے چھین رکھا ہے تم نے میرے بیٹوں کو مجھ سے چھین رکھا ہے تم ایسی بیل ہو جو دوسروں کا خون چوس کر زندہ رہتی ہے تم مر کیوں نہیں جاتی ہو۔''اور وہ دیوار کے ساتھ لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔''مجھے نہ جانے کب تک تمہارے

مرنے کا انتظار کرنا پڑے گا...... کب میں ان کی وارث بنوں گی۔" اور میں جو حیات کی اتنی لمبی راہ عبور کر کے سکھ کی چھاؤں تلے بیٹھ جانے کا سوچ رہی تھی ایک دم برہنہ پا کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ چھاؤں کہاں ہے جس کو میں نے خون جگر دے کر تنا تھا۔ اور میں تو حیات کی کڑی چلچلاتی دھوپ میں کھڑ ہوں۔ اکیلی اور ویران جانوں تو اندر ہے بیمار اور لاغر......

نوراں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے میں تو بنجر دھرتی تھی مجھے ہریاول کے خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بھلا خواب کی بھی کوئی بنیاد ہوتی ہے میں نے تو اپنے ادھ کھلے پٹ سے اندر آتے اندھیرے سے کبھی مات نہیں کھائی تھی میں سب کچھ برداشت کر سکتی تھی...... میں خوابوں کے سہارے خوشبوؤں کے سہارے زندہ رہ سکتی ہوں۔

میں نوراں کو کیا کہتی میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے پکڑ کر اسے اٹھایا اور اس کے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"نوراں مجھے معاف کر دو میں جس جبر کا شکار تھی انجانے میں میں نے تمہیں بھی اس کا شکار بنا دیا۔ لیکن میں نے پہلے روز کے وعدے کو کبھی

نہیں توڑا۔"

اور میں کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر جان محمد کے پاس اندر چلی گئی تھی……اور پھر جب صبح ہوئی تو میں اندر بیٹھی نوراں کے پاس ان کی آوازیں سنتی رہتی۔نوراں جوان کی ماں تھی نوراں کے چہرے پر اب ایک انوکھی سی جوت جلی نظر آتی اور میں سوچتی کہ ہم دونوں سے گھاتے میں کون رہا میں یا نوراں

اور جان محمد چارپائی پر کروٹ بدلتے ہوئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا اور کہا تھا۔

"کرم بی بی کیا یہ تم ہو۔" اور میں نے جواب دیا تھا "جان محمد ہم دونوں کا سفر شاید ختم ہو گیا ہے۔"

جان محمد نے اپنی کمزور آنکھوں سے ہمیشہ کی طرح بہت غور سے مجھے دیکھا تھا اور زور زور سے کھانسنے لگا تھا اور پوچھا تھا۔"بچوں کو روٹی پکا کر کون دے گا؟"

"جان محمد کیا تم بھول گئے ہو کہ بچوں کی ماں میں نہیں نوراں ہے

‘‘یہ کہتے ہوئے میرا دل دکھ سے ڈوب گیا تھا۔

جانوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ ہر بات کا تو جواب نہیں ہوتا۔ اور میں نے سوچا تھا کیا ہوا اگر وہ نوراں کے بیٹے ہیں ان کے دلوں میں میری گود کی گرمی بھی تو شامل ہے ان کی آنکھوں میں میری چاہت کے ستارے بھی تو روشن ہیں کچھ دے کر ہی تو کچھ پایا جاتا ہے اور میں نے بہت کچھ دے کر بہت کچھ پایا ہے...... میں نے زندگی کے رنگ برت کر دیکھ لیے ہیں۔

جانوں نے سیاہ دبیز دھواں میرے سامنے چھوڑ دیا تھا اور دھوئیں کے اس پار بیٹے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب کچھ اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ میں جان محمد نوراں اور وہ پانچوں جو میرے خواب کا ثمر تھے۔

جانوں کی خالی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے میں خیالوں کے تانے بانے میں ہمیشہ الجھ جاتی ہوں وہ دھرتی جس کے سہاگ کیل لیے میں نے اپنی جوانی اور زندگی کی راحتوں کا سودا کیا تھا میری نہیں ہے جانوں کے بیٹوں کی ہے۔ نوراں کی ہے جانوں کے جانے کے بعد مجھے لگتا ہے جیسے میں ایک اجڑا

ہوا اور ٹنڈ منڈ درخت ہوں جس کی جڑیں سوکھ گئی ہیں جس کی شاخوں پر کوئی کوئل نہیں کوکتی، کوئی سبز پتا نہیں آتا۔ میں ایسا سوچنا نہیں چاہتی تھی، کیونکہ اب بھی میرے کندھوں پر جانوں کے پانچوں بیٹوں کا بوجھ پڑا جان پڑتا ہے۔ ان کے ننھے منے جسموں کی گرمی اور ان کی معصوم بوسوں کی مٹھاس میرے ہونٹوں سے اتر کر میرے دل میں جا گھستی ہے۔ وہ اب بھی مجھے ماں کہتے ہیں۔

"کیا یہ سب کچھ میرے لیے کافی نہیں۔" میں اپنے آپ کو سمجھاتی ہوں لیکن پھر لگتا ہے جیسے جھکڑ اور آندھیاں میرے وجود سے اٹھ کر میری آنکھوں کے آگے چھا گئی ہوں۔ میں رونے لگتی ہوں میرا رشتہ تو جان محمد کی وساطت سیت ھا اور اب جان محمد نہیں ہے وہ نہیں ہے اور میں بھی ایک کھوکھلے تنے کی طرح زمین سے اوپر ہی کھڑی ہوں کسی بھی جھونکے سے گرنے کے لیے تیار میں اس جھونکے کے انتظار میں جی رہی ہوں...... وہ جھونکا نہ جانے کب آئے گا مجھ میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے بے جان بازوؤں کو سینے تک لے جا کر جانوں کا ماتم کرسکوں میں جو اپنے آپ کو زمین کی طرح

پھیلا ہوا سمجھتی تھی ٹوٹی شاخ کی مانند زمین پر ڈھیر ہو گئی ہوں مجھے کون سمیٹے گا؟ کون مجھے سہارا دے گا؟ جانوں تو چلا گیا وہ پانچوں جن کو میں جنم نہ دے سکی میں نے انہیں اپنی محبت کی کچی ڈور میں باندھ رکھا تھا اور اس ڈور کا سرا جان محمد کے ہاتھ میں تھا۔

جان محمد دھرتی کے انتر میں اتر گیا ہے اور میں بھی منتظر ہوں یہ دھرتی ہمیں اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور ہم احتجاج کرنے کے باوجود اس کے اندر اتر جاتے ہیں یہ دھرتی کتنی جابر ہے میرا دل بین کر رہا ہے......شاید ان بیتی گھڑیوں کا جو میں نے جانوں کو گنوا کر بتائی تھیں یا اپنی کوکھ کو ویرانی کا یا آنے والی تنہائی کا جو میرے وجود کو ذرہ ذرہ نگلتی جا رہی ہے باہر پھیلی دھرتی خاموش ہے اب اسے دیکھ کر میرے اندر کوئی خواب بیدار نہیں ہوتا۔ سونی راہ پر نظریں جمائے میں نہ جانے کن کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔

دبی دبی سسکار سب طرف پھیلتی جا رہی ہے اور جانوں کی چارپائی پر لیٹے نہ جانے مجھے کون سے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے راہ تو پھر بھی سنسان ہے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر واپس جا رہا ہو

نڈھال اور مایوس...... یہ چاپ ...... شاید آخر شب کا کوئی مسافر ہو شاید جانوں کے قدموں کی چاپ ہے یا یہ میرے اپنے ہی قدم گونج رہے ہیں۔شاید میں میں ہی ہوں۔شاید۔

سناٹے کی گونج

چلتے چلتے اس کے پاؤں تھک چکے تھےاور خوف کا بے پر پرندہ ابھی تک اس کے ساتھ اڑتا چلا آ رہا تھا سیاہ رات کا چہرہ تاروں کی جوت کے باوجود بڑا اندھیرا لگ رہا تھا دور تک پھیلے کھیت خاموشی کی تنی چادر تلے حدِ نظر پھیلے تھے۔اس نے چمکتے ہوئے جگنوؤں کو دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ایک ساتھ جگمگا رہے تھے۔وہ کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر بیٹھ گیا۔

اساڑھ کی نرم ہوائیں سرسراہٹ پیدا کرتی مکی کے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی وہ خود کو ویران اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔اس نے اپنی پگڑی کو اتار

کر گھٹنوں پر رکھ لیا ہے ویرانی کا احساس اس کے اندر بڑھ رہا تھا۔ اس ویرانی کا احساس جو ملکھی کے انکار نے اس کے اندر پیدا کیا تھا۔

ایک روز ملکھی نے کہا:

"سن فضل دین دل کے سودے زبردستی کے سودے نہیں ہوتے میں اگر مجبور بھی کروں تو اپنے دل کو تیری راہ پر نہیں لا سکتی پھر اس سارے جھگڑے سے کیا فائدہ۔"

ملکھی نے چارے کا بڑا سا گٹھا اٹھایا تھا اور آگے کو چل دی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر ملکھی کا بازو پکڑنا چاہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے اندر سکڑ کر رہ گیا تھا، حالانکہ وہ نہ جانے کب سے اپنے آپ کو ملکھی کی راہ میں کھڑا پاتا تھا۔ ملکھی کا سادہ لباس اس کا دراز خوبصورت وجود اس کی آنکھیں جو سبز کھیتوں پر چمکتے ستاروں سے زیادہ روشن لگتی ہیں۔

ملکھی ٹھیک ہی تو کہتی ہے دل پر کیا زور ا اور اس کا دل ہمیشہ کی طرح ملکھی کو دیکھ کر زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ملکھی کے انکار کا تیز لاوا تھا جو اس کے سارے وجود کو جلا رہا تھا وہ اپنے کھیت کی مینڈھ کو پھاوڑے

سے اپنا سینہ چیر ڈالے اور اس کو نکال پھینکے جو صرف ملکھی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔

اس روز سورج کا روشن چہرہ فصلوں کی ہریالی پر جھکا ہوا تھا اور نیلا شفاف آسمان بہت ہی نکھرا ہوا اور اجلا لگ رہا تھا آسمان کا رنگ ملکھی کے چہرے سے زیادہ من بھاتا تو نہیں تھا۔ وہ اپنی سوچ پر بے بسی سے کھڑا رہ گیا تھا۔

ہوا رات کی سیاہی میں گھلی فصلوں پر بہہ رہی تھی اور اس کے اندر کی آگ اسی طرح دہک رہی تھی کیا یہ آگ ملکھی کے خون نے ٹھنڈی کر دی تھی۔

ملکھی جو حسین علی کے پیچھے دیوانی ہو کر اسے بھول بیٹھی تھی ملکھی جس کی نظروں میں حسین علی کے سوا اور کوئی سما ہی نہیں سکا۔

کھیتوں سے سرسر کا مدھم شور اٹھ رہا تھا جیسے ملکھی آخری سانسیں لے رہی ہے جیسے وہ اس کے سامنے پڑی کراہ رہی ہو جیسے کہہ رہی ہو حسین علی...... حسین علی...... فضل دین نہیں۔

وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا......شاید اس کی کراہیں اس کا پیچھا کرنے لگی ہیں......تم میری کراہوں سے اتنی جلدی پیچھا نہیں چھڑا سکو گے فضل دین۔'' جیسے ملکھی کی آنکھوں کا کرب اسے کہہ رہا ہو اس نے خون آلود پھاوڑے کو دیکھا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا خون جو ملکھی کے چہرے پر شفق بن کر دہکتا رہتا تھا۔ جو زمین کی نرمی میں مل رہا تھا جو انتقام کا جذبہ بن کر نہ جانے کتنے عرصہ اسے جلاتا رہا تھا۔ اس نے ایک دم پھوڑے کو اپنے ہاتھوں سے پھینک دیا اور آگے چل پڑا، لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی ٹانگیں بوجھل ہو کر اس کے جسم کو نیچے کی طرف گھسیٹ رہی ہیں۔

''صبح ہونے میں تو ابھی بہت دیر ہے،'' اس نے مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا مجھے چلنا چاہیے پولیس میرے تعاقب میں ہو گی۔''

لیکن وہ تو بس ملکھی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ دم گھونٹ دینے والا سناٹا اس کے سب طرف پھیلا ہوا تھا۔ دور کسی درخت پر ایک الو تیز چیختی ہوئی آواز میں بولا......ہو......ہو......ہو......

میری روح کا بوجھ تو ہٹ جانا چاہیے تھا لیکن میں تو اس کے بڑھتے

بوجھ میں پس رہا ہوں وہ وہاں یوں کھڑا ہو گیا جیسے اسے کہیں نہ جانا ہو۔

"ملکھی نہیں رہی ______ دکھ کا انجانا ہاتھ اس کے دل کو مسل رہا تھا ______ تو ملکھی نہیں رہی...... نیلی بار کی سب سے خوبصورت عورت ______ وہ سوچوں کے دھارے میں ڈوبا وہاں کھڑا رہا تھا ______ وہاں جہاں سے کوئی راہ نہ جاتی تھی سب راہیں مٹ گئی تھیں کیونکہ اب دنیا میں ملکھی نہیں تھی۔ اس کے اندر آگ اسی طرح دہک رہی تھی ______ یہ سناٹا اتنا گونج کیوں رہا ہے مجھے ڈر لگ رہا تھا مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔

نیلی بار کے جوان اور گھوڑے برابر کے بانکے اور سجیلے لگ رہے تھے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو اپنی بھینسوں کا دودھ گھی پلا کر جوان کیا تھا۔ ان کے بھورے چکنے بدن اور سیاہ چمکیلے سم زمین کو نرم کر رہے تھے۔ راکھے باگوں کو ہاتھوں میں پکڑنے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے دراز قد جوان پگڑیوں کے شملوں کو اکڑائے اترائے اترائے پھر رہے تھے ان کے دہکتے چہروں اور روشن آنکھوں کی جوت دن میں بھی ستاروں کی

ماند روشن تھی۔سورج کا تھال کاتک کی نئی سردی کی سوچ میں ڈوبا وہاں گاؤں کی دھول بکھری گلیوں کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

حسین علی نے اپنی سیاہ چمکیلی زلفوں پر بڑے بانکے انداز میں پگڑی باندھ رکھی تھی اور چپ چاپ اپنے سیاہ خوبصورت گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا بار بار اسے چمکارتا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ملکھی اللہ دادا چاچا کی حویلی کی دیوار کے برابر اپنے گھر کے صحن میں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی اس کا سبز دوپٹہ سنہرے چہرے کے گرد ہمیشہ کی طرح کھل رہا تھا حسین علی نے ایک ساعت اور پھر اپنے گھوڑے کو چمکانے لگا۔

کیسا بدھو جوان ہے ملکھی کو اس کا یہ لاپرواسا انداز بہت برا لگا تھا پھر اس کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اور وہ اپنی بھینس کو کھو پر پانی پلانے چل پڑی اس کا باپ اور فضل دین بھی اس میدان میں موجود تھے اس نے حسین علی کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور وہ خود حیران رہ گئی تھی کہ یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر خود بخود کیسے آ گئی تھی لیکن حسین علی جھک کر اپنی

جوتی سے گرد جھاڑنے لگ گیا تھا یہ مجھے کیوں نہیں دیکھ رہا مجھے جسے سب ہی دیکھتے ہیں ملکھی کو اپنا آپ ایک دم حقیر اور بے معنی سا لگنے لگا۔ وہ بلاوجہ ہی اپنی بھینس کو پیٹنے لگی۔

فضل دین نے اس کو دیکھا تھا اور گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے کھوپر آ گیا تھا۔

''ملکھی مجھے پانی نہیں پلاؤ گی؟''

ساری بات اپنے اندر کی گہرائیوں کی پیاس کی تھی۔

ملکھی مسکرائی۔ ''فضل دین! بھلا یہ کون ہے جو یوں اکڑ کر کھڑا ہے جیسے ہمارے گھوڑوں سے بڑھیا ہے نا اس کا گھوڑا۔''

ملکھی نے فضل دین کی اوک میں پانی انڈیلتے ہوئے سوچا۔

فضل دین نے ایک ساعت کو سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ شک کا غیر محسوس احساس اس کے اندر بھرا تھا لیکن ملکھی تو اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

سورج کا چمکیلا تھال آموں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ سا گیا تھا۔ ہوا کے ساتھ گرد کے ننھے ننھے بگولے میدان میں اڑتے پھر رہے تھے۔ اس نے

پانی کے مشکیزے کی اوٹ لے کر ایک بار پھر حسین علی کی طرف دیکھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل کے اندر کیسی ویرانی بھر گئی۔

اس نے واپس جاتے ہوئے اندر نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے پاؤں اٹھ بھی تو نہیں رہے تھے۔ ''یہ مجھے کیوں نہیں دیکھتا۔'' وہ سوچ رہی تھی۔

وہ سب اپنے شنگارے ہوئے گھوڑوں کی ملائم پشتوں پر سوار ہو گئے بیل گاڑیوں پر ان کی ضرورت کا سامان لدا ہوا تھا اور بیلوں کے گھلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں گرد آلود ہوا میں دیر تک سنائی دیتی رہی تھیں۔ وہ سب شہر کی طرف مڑ گئے تھے۔ مویشیوں کے بڑے میلے میں حصو لینے کے لیے ملکھی اس خالی راہ کو کھڑی دیکھتی رہی تھی جس راہ سے وہ چہرہ چلا گیا تھا یہ چہرہ اس کی یاد کی سطح میں گہرا سا کھد گیا تھا شاید اس لیے کہ ملکھی نے تو اسے دیکھا لیکن اس نے ملکھی کو نہیں دیکھا تھا۔

پورے چار دن ملکھی اس راہ سے ہو کر کھیتوں کو جاتی رہی تھی وہ چند لمحے رک کر شہر سے آنے والی راہ کو دیکھتی اور اس کے اندر غصہ بھرنے لگا

''پر میں کس کی ______ اپنے نظر انداز کیسے جان کا غصہ ______

راہ تک رہی ہوں ______ اپنے بابا کی یا ______ ؟ میرا اس سے کیا واسطہ کیا؟'' وہ اپنے آپ سے الجھ پڑی ______ کیا وہ اس راہ سے واپس آئے گا؟ اسے پتہ چل جائے گا کہ میں اس کی راہ دیکھتی ہوں پھر وہ بے جان قدموں سے اپنے کھیت کی راہ ہو لیتی۔

چوتھے روز جب گھوڑوں اور بیل گاڑیوں کا قافلہ خوشی کے ڈھول بجاتا گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوا تو وہ بھی شور کرتے بچوں اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کے پیچھے کھڑی خوشی کی انجانی روشنی میں گلابی ہو رہی تھی۔

مراثی ڈھول بجا رہے تھے چاچا حویلی کے سامنے رنگین پایوں والی کھاٹیں برابر بچھی تھیں کامے خاطر تواضع کرتے تیز تیز قدموں سے آجا رہے تھے۔ ملکھی اپنے صحن کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی اس رونق اور شور میں اس چہرے کو ڈھونڈنے لگی جو اسے کہیں نظر نہ آ رہا تھا تو بغیر کسی سبب کے مسکرانے لگی تھی۔ اس نے ماں سے بڑی منتوں سے موٹی ململ کا نیا سبز دوپٹہ مانگا تھا اور کوٹھڑی میں گھس کر اپنی سیاہ بالوں کی موٹی سی چٹیا کو کھول کر دوبارہ باندھا تھا۔ آنکھوں میں دیئے کی لو پر بنائے گئے کاجل کی تیز لکیر

"کیوں ملکھی کہاں جا رہی ہو؟"

ماں نے اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"کہیں نہیں ماں۔"

وہ گھبرا کر بولی تھی اور درخت کی اوٹ میں کھڑی ہوگئی

"اندر آؤ۔ تمہارے بھائی خفا ہوں گے۔"

ماں نے ڈانٹا تھا لیکن اسے ماں کی ڈانٹ ذرا بھی بری نہیں لگی تھی

وہ تو صرف ایک بار اس چہرے کو دیکھنے جا رہی تھی۔

"ماں ذرا رونق دیکھ رہی ہوں ______ روز روز تو ایسی رونق نہیں ہوتی نا ماں......" وہ کچھ اور آگے بڑھ گئی ______ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا ______" وہ دل ہی دل میں رنجیدہ ہوگئی تھی۔

جوانوں کی تیز تیز باتیں قہقہے بچوں کا شور مراثی کے ڈھول کی بھاری آواز لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل اس کے پہلو میں ٹھہر گیا ہو سب طرف دھول اڑ رہی ہو وہ کھڑی رہی اور پھر واپس آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اس نے اپنے نئے دوپٹے کو اتار کر بے دلی سے پھینک دیا اور وہی سیاہ دوپٹہ

اوڑھ لیا جو بدرنگ ہو چکا تھا۔

ہوا ہولے ہولے اڑ رہی تھی۔ مکی کی باس گنے کی میٹھی باس اور گرد کے باس سب کچھ اس کے بھاری ذہن پر تیر رہا تھا باہر گیس کے ہنڈولوں کی تیز روشنی میدانوں کو جگمگا رہی تھی۔

''میں نمانی ہنجواں ماری ______ صالولیا بھیو ______''

مراثی کوئی نیا گیت گا رہا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی ''کیسا اداس گیت گا رہا ہے کیسا غلط گیت ہے یہ۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی آسمان سیاہ تھا اور ستارے جیسے بہت دور چمک رہے تھے۔

''جی آیاں نوں۔ جی آیاں نوں۔''

اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

اس نے سامنے دیکھا وہی خوبصورت دہکتا چہرہ ______ اس کا سارا وجود ایک دم انجانی خوشی میں بھیگ گیا اور وہ مسکرا دی۔ حسین علی جیسے گھبرا کر بیٹھ گیا۔ ''بدھو کہیں کا۔'' ملکھی زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

ماں نے اسے کیا کھلایا ______ وہ سارا وقت کیا کرتی رہتی تھی

۔اسے کچھ یاد نہیں تھا۔بس وہ ایسے قدموں کے ساتھ جو اس کے وجود کو اڑائے پھر رہے تھے وہاں موجود رہی تھی اور جب حسین علی اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھنے لگا تو وہ آہستہ سے بولی ______ ''کیا تمہاری آنکھیں نہیں جو دوسروں کو دیکھ سکیں ______ ''اور پھر وہ تیزی سے اندر کوٹھڑی میں چلی گئی تھی۔

اس کو لگ رہا تھا جیسے آگ اس کے سارے جسم کو جلا رہی ہے۔

اب کیا ہوگا ______ !اب کیا ہوگا ______ وہ کیا سوچے گا۔اس کوٹھڑی کے اندھیرے میں کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے ۔جیسے کسی دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونا چاہ رہی ہو ______ لیکن سہارا کہاں تھا _ _ _ _ _ _ لیکن سہارا کہاں تھا _ _ _ _ _ _ سن ______ سن ______ سن ______ لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔''وہ تو کچھ نہیں دیکھتا اور مجھے اسے دکھانا ہے۔اپنا آپ _ _ _ _ _ _ میں _ _ _ _ _ _ جو ملکھی ہوں ...... ملکھی ______ جس کا کوئی جوڑ دس گاؤں میں نہیں ______ وہ ضرور مجھے

دیکھے گا۔میرے سیاہ لمبے بالوں کو۔میرے سنہرے رنگ کو

______ میرے سارے روپ کو......''

اس نے ہولے ہولے اپنے ہاتھ اپنے جسم پر پھیرے

______ میں تو وہ ہوں جس کے لیے فضل دین جیسا جوان راہوں میں

کھڑا رہتا۔یہ کیسی تپش میرے اندر اُٹھ رہی ہے۔جی کو جلانے والی

______ آج کی رات ______ ہاں، آج کی رات

______ ہوسکتا ہے یہ رات پھر کبھی نہ آئے۔

اور پھر نہ جانے کیسے وہ حسین علی کی کھاٹ کے پاس جا کر کھڑی

ہوگئی اور جب حسین علی جاگا تو وہ خاموش کھڑی رہی تھی۔اپنے سے آگاہ

______ اپنے جادو کا زور جانتی ہوئی ______ اپنے جسم کی قوسوں

سے مانوس۔

''کون ہو تم؟'' حسین علی کی آواز خوفزدہ تھی

''میں جو بھی ہوں صرف تیری ہوں۔'' ملکھی نے اس مٹیالے

اندھیرے میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا اور

اسے لگا جیسے یہی وہ سچ تھا جسے بولنے کے لیے وہ زندہ تھی۔

کھیت کے کنارے چاند کا کمزور سا ابھرتا ہوا وجود بڑا ہی اکیلا لگ رہا تھا پاس ہی باڑے میں مویشی سوئے جگے جگالی کر رہے تھے اس ساری خاموشی میں صرف ایک اس کا دل تھا جو تیز تیز دھڑک رہا تھا اس کے اختیار سے باہر......اس کی مرضی کے خلاف وہ تو بس اس کے شوق کو ہوا دینا چاہتی تھی۔

اور اب وہ اپنے اندر کے سچ سے خائف ہو رہی تھی حسین علی خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟''

وہ قطرہ قطرہ بہہ کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو رہی تھی اس کا سارا انتر اس کا سارا زندہ رہنے کا احساس وہ جو کچھ بھی تھی بس اس مرد کے لیے تھی یہ مرد جو نہ جانے کیوں اسے بھا گیا تھا۔

''میں کیا بولوں۔'' حسین علی کی آواز میں لرزش سی تھی۔

''کیا میں تجھے اچھی لگی ہوں۔''

”میں عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

وہ اب بھی گھبرایا گھبرایا سا کھڑا تھا۔

”مجھے عورتوں کا شوق نہیں۔“

ملکھی ہولے سے ہنسی اسے یہ ڈرا ڈرا سا مرد اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔

”تو عوتوں کا شوقین نہیں لیکن میں تیری شوقین ہوں۔ حسین علی میں عورت تو ہوں لیکن یہ عورت ملکھی ہے لے مجھے دیکھ لے پھر بتانا۔“

وہ درخت کے سائے سے نکل کر چاند کی مدھم روشنی میں کھڑی ہوگئی اس کی شاخ کی طرح لچکیلا بدن اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی انوکھی جوت وہ اس ملگجے اندھیرے میں بھیرا اجلی لگ رہی تھی اس کے چہرے پر عجیب سا انتظار تھا۔ وہ اسے کچھ لمحے دیکھتا رہا پھر آنکھیں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

ملکھی مسکرا رہی تھی اپنی فتحمندی کے یقین پر۔

”جواب دو۔“

''میں پھر جواب دوں گا کسی وقت پھر وہ تیزی سے پلٹ کر اندر چلا گیا وہ وہیں ملگجے اندھیرے میں کھڑی ہو گئی تھی جیسے ساکت ہو گئی ہو کھیتوں پر چلتی ہوا آگے ہی آگے بہتی جا رہی ہے آنسوؤں کی گرم دھار اس کے گالوں کو بھگونے لگی لیکن وہ مایوس نہیں تھی وہ بہت کچھ کر سکتی تھی لیکن اس وقت وہ صرف اس مرد کے بارے میں سوچتی جا رہی تھی جو گھبراہٹ کے مارے اس کے چہرے کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا۔

میں ملکھی ہوں اور حسین علی ایک مرد ہے اس نے یقین کے ساتھ سوچا پھر دل کی تہوں سے اٹھتا درد بڑا ہی جان لیوا لگ رہا ہے اور وہ مسکرانے کی خواہش کے باوجود مسکرا نہیں سکتی تھی۔ ''میں ملکھی ہوں۔'' اس نے زیر لب دہرایا اور وہ وہاں اس بے کنار وسعت میں کھڑی اپنے آپ کو پہلی بار اکیلا اور ویران پا رہی تھی۔

کھیتوں سے آتے کھیتوں کو جاتے وہ خانپور سے آنے والی راہ پر رک جاتی چارے کا گٹھا اٹھاتے وہی بلوتے چرخہ کاتتے وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب سا دیکھتی رہتی اپنے آپ سے کی گئی باتیں ہوتیں اور حسین علی

کے چہرے پر دمکتی لالی کا رنگ ہوتا۔" وہ بھی میرے بارے میں سوچتا تو ہو گا۔" چلتے چلتے وہ رک جاتی ہو سکتا ہے وہ اسی راہ پر چلا آ رہا ہو لیکن راہ خالی ہوتی۔

پوہ کے مہینے کی یخ سردی اس کے اندر کی تپش کو ٹھنڈا کر سکتی۔ وہ اپنی کوٹھڑی کا دروازہ کھلے خاموش کھڑی ہو جاتی دور دودھیا آسمان پر چاند کا پورا چہرہ ٹھٹھرا ہوا اور روشن لگتا وہ اپنی کیفیت پر خود بھی حیران تھی اس نے اپنے آپ کو بارہا سمجھایا تھا لیکن کوئی نادیدہ قوت بار بار اسے حسین علی کے دمکتے چہرے کو بھول بھلیوں میں پھنسا دیتی اور خوفزدہ ہو کر کام میں مصروف ہونے کی کوشش کرتی۔

ایک دن اس نے فضل دین کو کہا تھا۔

"دیکھو فضل دین میری راہ نہ روکا کر میں جہاں تجھے نظر آتی ہوں وہاں نہیں ہوتی میں تو پتہ نہیں کہاں ہوتی ہوں مجھے تو اپنی خبر نہیں لگتی۔"

اور وہ ہولے ہولے ہنسنے لگی بے چارگی کی ہنسی

"لگتا ہے ملکھی جیسے کسی کھوئی چیز کو ڈھونڈ رہی ہو تم اور ہو سکتا ہے وہ

کھوئی چیز میں ہی ہوں۔"

فضل دین کے چہرے پر محبت کا کرب تھا۔

ملکھی نے اسے دیکھا اور زور سے ہنس پڑی

تو تو پاگل ہے میں تو سگ توڑ رہی ہوں بھلا یہں کیا گم ہوسکتا ہے

میرا ______ "ملکھی تیزی سے ساگ توڑنے لگی۔

فضل دین اسے ساگ توڑتے دیکھتا رہا ملکھی کھڑی ہوگئی اس دھلے نکھرے ماحول میں سرسوں کے پیلے پھول ہوا میں ہولے ہولے آگے پیچھے جھوم رہے تھے۔ چڑیوں کا ایک جنڈ تیزی سے آ کر کھیتوں کی ہریالی میں گم ہوگیا۔ فضل دین اور وہ اس وسعت میں گھرے اپنے اپنے دل کی دنیا میں کھو سے گئے تھے۔

دل جو اپنے اندا کی جہان کی وسعت سمیت لیتا ہے۔

اور پھر ملکھی دامن کو سمیٹے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی ۔

"وہ میری بدنصیبی کا وقت تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا۔ ملکھی غمزدہ ہوکر سوچتی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنی روح کی پوری

شدت سے حسین علی کو آواز دے اس کا نام پکارتی ہی جائے۔

خانپور کی راہ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی لامتناہی فاصلوں پر پھیلی لگ رہی تھی اس کی اندر کی آگ جس نے اسے جلا کر بھسم کر دیا تھا۔ اسے اپنے آپ سے بھی بے گانہ کر دیا تھا وہ تیزی سے اس راہ پر چلی جا رہی تھی کھوئی کھوئی سی۔ اور جب حسین علی کی حویلی کے باہر اس نے چونک کر دیکھا تو وہ حیران رہی گئی میں کہاں آ گئی مگر اب وہ رات کی تنہائی میں غیر مرئی روح کی مانند اپنے آپ کو ہلکی محسوس کر رہی تھی ـــــــــــ ”یہی تو وہ گھر ہے جس کے بارے میں سوچتے سوچتے میں نے کئی راتیں گزار دی ہیں۔“

اس نے حسین علی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔

”ہاں یہ خوشبو صرف اسی کی ہے وہی خوشبو جو اس رات سے اب تک اس کے حواس پر چھا رہی ہے یہ کوئی دوسرا نہیں وہ جھکی اور اس نے حسین علی کے جسم کو جان کی پوری نرمی کے ساتھ اٹھا لیا اور چل پڑی۔ تب اسے اپنا وجود بھی ہوا کی مانند ہلکا لگ رہا تھا سب طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ روشنی تو صرف اس کے دل کے اندر تھی جو اس مرد کے خیال نے جلا رکھی تھی جو

اسے پوری طرح جانتا بھی نہیں تھا۔

جب حسین علی جاگا تو وہ ڈر گیا۔

''کون ہو تم؟ وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔

ملکھی ہنس رہی تھی ہنستی ہی جا رہی تھی

''کیوں آئی ہو تم یہاں؟ حسین علی اب بھی ڈرسا رہا تھا

''میں اکیلی تو نہیں آئی تم کو بھی ساتھ لائی ہوں۔''

وہ پھر ہنسنے لگی۔ جیسے ہوا گلوں کے ساتھ بندھی ہوئی چھوٹی گھنٹیوں کو ہولے ہولے ہلا رہی ہو۔

لیکن حسین علی کی آواز اس کی آ ۳ از میں شامل نہیں ہوئی۔ حسین علی چپ کھڑا تھا اور ملکھی کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کی ساری طاقت کسی نے ایک دم نکال دی ہو وہ مٹی کا ڈھیر ہو۔ اس کے اپنے آپ کو ثابت کرنے کے لیے سارے جذبے مٹی بن گئے ہوں۔

''میں یہاں کس طرح آیا؟'' حسین علی اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں لائی ہوں تمہیں اور کون لاتا۔"

"کیسے؟" حسین علی کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی اور غصہ بھی

"کندھے پر اٹھا کے۔"

ملکھی نے موہوم آس میں اس کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن حسین علی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ملکھی کا سارا وجود جگ رہا تھا مگر لمس کا وہ لمحہ نہ جانے کہا کھو گیا تھا۔

"ملکھی لوگو کیا کہیں گے۔" اب حسین علی کی آواز میں نرمی تھی

"لوگ یہی کہیں گے حسین علی کی ملکھی بے مول بک گئی۔ وہ جس کی لوگ بڑی قیمت لگاتے تھے بہت ہلکی ہو کر حسین علی کے سامنے گر پڑی۔"

ملکھی کی آنکھوں کے آنسوں وہاں درخت کے سیاہ سائے میں نم زمین پر گر کر پھیل رہے تھے۔

"یہ بات نہیں ملکھی تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن اس طرح تمہاری بدنامی ہو گی......" حسین علی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میں کسی سے نہیں ڈرتی دنیا سے ماں باپ سے بھائیں سے وہ

مجھے مار ہی دیں گے نا اور کیا کریں گے لیکن یہ تم سے جدائی جان دینے کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے۔''

ملکھی کی آواز میں خود اعتمادی کی گونج تھی

''مجھے سوچنے دو ملکھی۔''

حسین علی سائے سے نکل کر چاندنی میں اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ملکھی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

''کیا سوچو گے سوچ لو لیکن دیکھو مجھے بے آس نہ کرنا۔''

اور پھر وہ مسکراتی ہوئی اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنے گاؤں جانے والے رستے پر مڑ گیا۔ پھر ملکھی کو ایک دم اپنے تنہا رہ جانے کا احساس ہوا پھر وہ یوں چلنے لگی جیسے اس کا ہر قدم اس کی پاتا کی طرف لیے جا رہا ہو۔''

چاچا اللہ دادا کی بیٹی کی بارات خانپور سے آئی تھی حویلی کے باہر پنڈال میں لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا حسین علی دور لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا ملکھی مسکرادی۔ اور پھر ڈھولک کے

ساتھ اس کی آواز سب سے اونچی اور خوبصورت ہو کر ساری آوازوں پر چھا گئی پھر وہ کھیتوں کو چل دی۔

"وہ مجھے ملنے آئے گا۔" وہ کھیت کے پاس کھالی میں اپنے اندر کی تپش سے جلتے ہاتھوں کو بھگو کر اپنے چہرے پر رکھے اس کی راہ تکنے لگی لیکن راہ سونی رہی اور وقت گزرتا رہا ہو سکتا ہے اس نے مجھے نہ دیکھا ہو دیکھا ہوگا تو وہ مجھ سے ضرور ملنے آئے گا۔

"ملکھی یہاں کیا کر رہی ہو؟"

فضل دین کو آتے اس نے نہیں دیکھا تھا نہ معلوم وہ کون سی راہ سے آیا تھا۔

ملکھی میں کب تک تمہاری راہ دیکھوں؟"

فضل دین کی آواز میں ہمیشہ کی طرح منت بھری تھی

ملکھی نے جھکا سر اٹھا کر اس راہ کو دیکھا جو گاؤں کی طرف جا رہی تھی اور جو ابھی تک سونی تھی۔

"فضل دین مجھ سے کیا پوچھتے ہو میرے پاس تمہارے سوال کا

جواب نہیں۔"

اور وہ اٹھ کر ساگ توڑنے لگی اس نے نرم نرم پتے توڑ کر اپنا دامن

بھر لیا۔

"ملکھی کیا تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔" فضل دین پھر بولا:

کوئی کسی پر ترس نہیں کھاتا فضل دین کوئی دل کی بات نہیں سنتا دل تو

ساگ کی گندل ہے ٹوٹی تو گئی۔"

اس نے اپنے دامن کا سارا ساگ پھر زمین پر ڈال دیا۔

"دیکھا یہ گندلیں دوبارہ ہری نہیں ہو سکتیں۔"

وہ خالی خالی آواز میں بولی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ملکھی اکیلی کھیتوں میں پھرتی رہتی ہو۔ فضل دین

پریشان ہو کر بولا

"یہی بات تو میں تم سے پوچھتی ہوں فضل دین تمہیں کیا ہو گیا ہے

میرے پیچھے مت آیا کرو جاؤ کسی اور سے دل لگا لو۔"

"نہیں ملکھی دل بہت منہ زور ہوتا ہے اس پر میرا بس نہیں

چلتا۔" وہ دکھ سے بولا میں خالی ہاتھ ہوں فضل دین وہ زور زور سے چلانے لگی مجھے کسی نے کیا دیا ہے جو میں اس میں سے کسی کو دوں جاؤ خدا کے لیے چلے جاؤ۔"

وہ زمین پر جھک کر بلک بلک کر رونے لگی فضل دین اس کے پاس ہی بیٹھ گیا وہ جان گیا تھا جس ملکھی کی کھوج میں زمانوں سے سرگرداں رہا ہے وہ کہیں اور کھو گئی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر اس عورت کو برباد کر دے۔

کیا دھرتی ہمیشہ ہی بانجھ ہوتی ہے ملکھی نے راہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا......لیکن وہ تو خود سے مخاطب تھی۔

"ہاں ملکھی!"

اور فضل دین تیزی سے اپنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

ملکھی وہیں کھڑی رہی اس کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی جیسے اعلان کر رہی ہے میں حسین علی سے ہاروں گی نہیں ______ ہارنا مجھے نہیں آتا۔

اس نے گاموں نائی کو اپنا گوٹا کناری لگا دوپٹہ دیتے ہوئے کہا:

"خانپور کے حسین علی سے کہنا یہ دوپٹہ اگر تم نے آ کر مجھے خود نہ اوڑھایا اور میر ڈولی لے کر نہ گئے تو پھر میں خود تمہیں آ کر لے جاؤں گی اور پھر لوگ تم پر ہنسیں گے اور میں نہیں چاہتی کہ لوگ تم پر ہنسیں۔"

گاموں نائی دوپٹے کو ہاتھوں میں لیے حیران کھڑا تھا۔ ملکھی نے چاندی کے کنگن اسے دیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری راہ تکتی رہوں گی دیر نہ کرنا۔"

وقت گزر ہی نہیں رہا وہ کھیتوں کی سیاہی میں ایک موہوم دھبے کی مانند کھڑی تھی گاموں نائی کا اس کی طرف ہر بڑھتا قدم سا کے دل میں وسوسوں کو جنم دے رہا تھا جب گاموں نے اس کا دوپٹہ اس کے ہاتھوں پر ڈال دیا تو اس کو اپنا وجود ایک دم پتھر ہوتا لگا تھا گاموں نے کہا۔

"بی بی حسین علی نے دوپٹہ واپس کرتے ہوئے کہا ہے کہ دوپٹہ گاؤں کی عزت ہوتا ہے اس اوڑھانے کا فیصلہ بڑے کرتے ہیں میں آؤں گا ضرور لیکن اپنے بڑوں کی مرضی کے ساتھ تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

وہ وہاں چاندکی مدھم روشنی میں کھڑی کانپ رہی تھی

کس بات کا انتظار گا موں۔ پھر اس نے رک کر پوچھا۔

”بولتے کیوں نہیں؟“

”بی بی میں اپنے پاس سے بات بنا کرتو نہیں کہوں گا اس نے تے بس اتنا ہی کہا تھا میں اس کے دل کا بھید کیا جانوں۔“ وہ آہستہ سے بولا اور واپس مڑ گیا۔

وہ وہیں پگڈنڈی پر بیٹھ گئی پاس ہی کھالی کا پانی چان کو لہر لہر بانٹ کر آگے بڑ رہا تھا اس نے اپنے دوپے کو کھول کر گھٹنوں پر پھیلا لیا۔اس کی کناری چاندنی میں چمک رہی تھی وہ اس کی دیکھتی رہی اور پھر آہستہ سے اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیا پھر وہ ہولے ہولے ہنسنے لگی اور جب ہنس چکی تو رونے لگی۔

ساری پر ہیا خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی ملکھی کا باپ ندامت کے مارے سر نہیں اٹھا رہا تھا کیونکہ اس کی بیٹی کی خانپور والوں نے شکایت کی تھی انہوں نے کہلوایا تھا۔

''اگر تم ملکھی پر پہرہ نہیں بٹھا سکتے تو راہوں کا پہرہ تو دے سکتے ہو۔ وہ راتوں کو ماری ماری پھرتی ہے۔''

اوراس کا باپ بوجھل قدموں سے چلتا گھر آ گیا تھا۔

لیکن ملکھی نے کہا تھا۔

''میری راہ روکنے والا کوئی نہیں میں جو چاہوں کروں جہاں چاہوں جاؤں خانپور والوں سے کہو میری ڈولی لینے آ جائیں یہی رواج ہے کیونکہ میں نے دل سے حسین علی کو اپنے سر کا سائیں مان لیا ہے۔''

اوراس کا باپ چاہنے کے باوجود ملکھی کے سامنے بےبس کھڑا رہ گیا تھا کیونکہ ملکھی کی آنکھوں نے اس کی سچائی کی گواہی دی تھی۔

''خدا کرے تم مر جاؤ ساری برادری تم پر تھوکتی ہے کوئی اور بھی تو اب تمہیں بیاہنے نہیں آئے گا۔'' اس کی ماں سینہ کوٹتے ہوئے بین کر رہی تھی۔

ماں تم سمجھ لو کہ ملکھی مر گئی تم بھی میرا سیاپہ کرو کیونکہ میں بھی اپنا سیاپہ کر رہی رہوں۔''

ملکھی نے سیاہ دوپٹے میں اپنے آنسوؤں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

فضل دین اس کی دہلیز کے اندر نہیں آیا تھا اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر کہا تھا۔ ماسی ملکھی سے کہہ دو کہ گھر سے باہر نہ آئے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

لیکن ملکھی نے کہا تھا۔

”سن فضل دین میں تو موت سے بھی نہیں ڈرتی تجھ سے کیا ڈروں گی تو مجھے موت کی دھمکی دینے آیا ہے نا“ وہ غصہ سے بھری اس کے سامنے کھڑی تھی۔

فضل دین کو لگ رہا تھا جیسے وہ دکھ اور مایوسی کے مارے یہیں کھڑا کھڑا مر جائے گا اس کی زندگی بھر کی آس اس کے سامنے ٹوٹ رہی تھی۔

”ملکھی میں تجھ کو کچھ نہیں کہتا لیکن تم جانتی ہو کہ یہ سودا اتنا آسان نہیں۔“ فضل دین تیزی سے بولا۔

ملکھی ہنس دی۔ ”تو جانتا ہے نا کہ دل کے سودے اتنے آسان نہیں اور میں تو ساری حدوں سے گزر کر بھی حسین علی تک جاؤں گی پھر میں

تجھ سے کیوں ڈروں۔"

اور وہ اندر چلی گئی۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتی تھی۔ وہ لوگوں کی باتیں ہنس کر سنتی اور سن کر ہنس پڑتی۔

"مجھے اپنا پتن کھوجنا ہے اور شاید سوہنی کی طرح میرے نصیب میں بھی ڈوبنا ہی ہے"۔

وہ حسین علی کے ساتھ خانپور کے اندھیروں میں کھڑی تھی۔

حسین علی نے کہا تھا۔

"ملکھی مجھے تمہاری طاقت سے ڈر لگتا ہے"۔

حسین علی کا چہرہ درختوں کے سیاہ اندھیرے میں بھی روشن لگ رہا تھا۔ یا صرف ملکھی کو ہی یہ روشنی نظر آ رہی تھ۔ حسین علی کے ساتھ کی گرمی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ تب حسین علی بھی اس کے لئے وہی محسوس کر رہا تھا، جو ایک مرد اپنی من چاہی عورت کے لئے محسوس کرتا ہے۔

"حسین علی! تُو میری طاقت کی بات کرتا ہے، میں تو بڑی کمزور

ہوں اسی لئے تو تیرا آسرا چاہتی ہوں“۔ وہ بولی۔

حسین علی کو ملکھی کی انوکھی سی باس اپنے گرد پھیلتی لگ رہی تھی۔

”حسین علی جانتے ہو، میں نے تمہارا واپس کیا ہوا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا۔ میں تمہاری دلہن بن گئی تھی“۔

ملکھی کی آواز خواب آلودسی تھی۔

”کیا میرے جسم سے تمہیں اپنے ہاتھوں کی خوشبو نہیں آ رہی۔ کیا میرے بولوں میں تمہیں اپنی آواز کی گونج سنائی نہیں دے رہی“۔ ملکھی اس کے سامنے جھک کر بیٹھ گئی۔ ”حسین علی میں تمہاری عورت ہوں“۔

وہ دونوں ہمیشہ کی طرح چپ چاپ ایک دوسرے کی موجودگی سے آگاہ تھے۔ رات کا وجدان دونوں کے گرد پھیلی آوازوں سے لبریز تھا، لیکن وہ کسی آواز کو نہیں سن رہے تھے۔

”راہ لمبی ہے، ملکھی اب تمہیں جانا چاہیے“۔ حسین علی نے چونک کر اپنے اردگرد دیکھا اور بولا:

”حسین علی۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے زمین تیزی سے میرے پاؤں

تلے سے سرکتی پیچھے کو بھاگتی جاتی ہے اور میں یہاں پہنچ جاتی ہوں"۔

ملکھی کی ہنسی رات کے ترنم میں آہٹ بن کر گونج رہی تھی۔ حسین علی بھی ہنسا۔

"دیکھو رات کے تارے مشرق کی طرف سفر کر رہے ہیں"۔

"اور تم ڈر رہے ہو"۔ ملکھی بولی۔

"ہاں ملکھی میں ڈرتا ہوں۔ اپنے آپ سے۔ اپنے باپ سے لیکن تم تو ہوا کا جھونکا بن کر یہاں آ جاتی ہو"۔

ملکھی نے آہستہ سے اس کا ہاتھ چھوا اور پھر اپنے گاؤں کی راہ مڑ گئی۔

رات کے تارے اندھیرے کے اوپر ٹنگے ہوئے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ملکھی کا سیاہ دوپٹہ اس کے پیچھے اڑ رہا تھا۔ حسین علی وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اسے جو بہت ہی اچھی لگنے لگی تھی۔ "کیسی عورت ہے"۔

حسین علی مسکرا رہا تھا۔

راہ میں فضل دین نے ملکھی کی راہ روک کر پوچھا۔

”تم کہاں سے آ رہی ہو؟“

اس کا سارا وجود ایک تکلیف دہ دکھ اور نفرت سے کانپ رہا تھا۔

”وہاں سے جہاں میں گئی تھی“۔ ملکھی ملا پرواہی سے بولی۔

”کیا سب مرد ایک نہیں ہوتے جو یوں ماری ماری پھرتی ہے؟ کیا گاؤں میں کوئی مرد نہیں تھا جو تجھ سے دل لگاتا؟ اس نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا تھا۔

”ایک تُو ہی ہے“۔ ملکھی نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے طنز سے کہا تھا“۔ لیکن یہ میرا اپنا معاملہ ہے تُو کون ہے پوچھنے والا“؟

”میں بھی تو تیرا بن سکتا ہوں“۔ فضل دین کی آواز بدلی ہوئی تھی“۔ تو کسی مرد کے پیچھے پھرتی، تو شاید میں چپ رہتا، لیکن تو ایک نامرد کے لئے ہلکان ہوتی پھرتی ہے جو خود آنے کی بجائے تجھے بلوا بھیجتا ہے۔ جو مرد اپنی عورت کی عزت نہ کرے وہ بھی کوئی مرد ہوا۔ ملکھی لوگ تجھ پر نفرین بھیجتے ہیں۔ تُو برباد ہو جائے گی۔ تجھ سے کوئی بیاہ نہیں کرے گا“۔

”مجھے کسی کی پرواہ نہیں فضل دین“۔

ملکھی اس کے پاس سے ہو کر آگے چل دی۔

"میں تجھ سے بیاہ کروں گا۔ سب باتوں کے باوجود۔ سب کی نفرت کے باوجود"۔

فضل دین پھر اس کی راہ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی آواز میں منت بھی تھی اور فیصلہ بھی تب وہ بولی:

"فضل دین میرا بیاہ تو حسین علی سے ہو بھی چکا"۔

فضل دین نے پھاوڑا اُٹھا کر ایک دم اس کے جسم میں اُتار دیا۔

اسے یکا یک اپنے گرد بڑھتے سناٹے کی گونج سنائی دینے لگی جیسے ملکھی کے جاتے ہی سارا جہان خالی ہو گیا تھا۔ وہ ملکھی پاس جھک کر بیٹھ گیا۔ ملکھی۔ ملکھی۔ اس نے اس کے بے جان ہاتھ کو چھوا۔ کھیتوں کی سرسراتی ہوا نے اس پکار کو دہرایا۔ ملکھی۔ ملکھی۔ تو وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اپنے اندر کے سناٹے سے۔ اپنے گرد پھیلتے ہوئے سناٹے سے۔

اور یہ سناٹا اس کے بھاگتے قدموں کی گونج کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

دھرتی کی باس

زہرا نے بازار میں کھڑے ہو کر آسمان کو دیکھا۔ سیاہ بادل مشرق کی طرف سے اُٹھ کر سب طرف چھا رہے تھے اور تیز ہوائیں گوشت مچھلی اور مرغیوں کی بیٹوں کی بساندے پُر اس کے لباس میں گھُستی آگے ہی آگے اڑی جا رہی تھیں۔ اِکا دُکا کاغذ پھڑ پھڑاتے۔ چکروں میں گھومتے اور رُک جاتے۔ اس نے اپنی ساڑھی کا پلّو اپنے سر اور جسم کے گرد زور سے لپیٹ لیا۔ اور دوسری ساتھی عورتوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے

ہاتھ میں پکڑی بال پوائنٹ پنسلوں کو دیکھا۔اور فکر مندی سے امنڈتی گھٹا کو دیکھنے لگی۔سردی کی تیز لہریں اس کے جسم کو سُن کر رہی تھیں۔لیکن وہ جانتی تھی وہ اس بازار میں کھڑی کہیں بھی نہیں جاسکتی تھی۔اور اس کا گھر جو ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔سردی کو روک سکتا تھا جہاں اس کی بیمار اور لاغر ماں کا وجود تھا۔جہاں اُسے خود بھی جا کر پناہ کا احساس ہوتا تھا۔لیکن جو اتنے برسوں سے پھر بھی اسے گھر نہیں لگتا تھا۔

''میرا گھر کون سا ہو گا۔کہاں ہو گا میرا گھر''۔وہ اس سوال کی بازگشت اپنے دل کے اندر گونجتی محسوس کرتی لیکن اس سوال کا جواب نہ سُوجھتا۔

لوگ تیز تیز قدم اُٹھائے جارہے تھے۔سایوں کی تلاش میں پناہ کی تلاش میں۔دنیا ہی دنیا اور وہ خود۔اسے نہ جانے ماں کے باوجود اپنا آپ اکیلا کیوں لگتا تھا۔وہ کہاں جائے۔اسے کس چیز کی کھوج تھی۔

رات اُس نے گہرے بادلوں میں چاند کی ڈوبتی اُبھرتی ناؤ کو دیکھا تھا اور چپ چاپ اس دور تک پھیلی بستی کے درمیان کھڑی رہی تھی۔جواب

اس کی پہچان بن گئی تھی۔ بہاریوں کی بستی کے درمیان کھڑی رہی تھی۔ جو اب اس کی پہچان بن گئی تھی۔ بہاریوں کی بستی۔ خانماں بربادوں کی بستی۔ جہاں زرد چہروں اور بوسیدہ لباسوں میں لپٹے بدن عجیب بے چارگی سے زندگی کی طرف گھسٹ رہے تھے۔ اس کا دل گہری اداسی میں ڈوب رہا تھا۔ پھر سلام اللہ نے آ کر آہستہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن پھر بھی کوئی گرمی اس کے ٹھنڈے وجود میں نہ دوڑی۔ اسے اندر سے اپنا آپ مرا ہوا اور بے جان لگتا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو سلام اللہ نے کہا تھا۔

دیکھ زہرا تو جو گزری باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے نا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آؤ ہم بھی گھر بنا لیں، پھر تمہارے ذہن کی یادیں خود بخود مٹ جائیں گی۔ تمہارے پاؤں اس دھرتی پر مضبوط ہو جائیں گے۔ زہرا اُس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن اُسے لگا جیسے ساری یادیں بھی اس کے ذہن میں جم گئی ہوں۔ بس بھوک افلاس۔ ماں کی لمبی بیماری اسی زندہ یادیں تھیں جو اس کے ذہن میں کلبلانے لگتیں یا پھر کبھی کبھار سلام اللہ کی باتیں جو اس کی زندگی کے اندھیرے میں چکا چوند کرنے

کی کوشش کرتیں۔ لیکن وہ زور سے اپنی آنکھیں بند کرلیتی۔ اسے ثبات کے کسی پہلو پر بھی یقین نہیں تھا۔ ''تم بولتی کیوں نہیں''۔ سلام اللہ کی آواز میں غصہ تھا۔ ''دیکھ سلام۔ مجھے یہ دھرتی اپنی نہیں لگتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس نے پوری طرح ہمارے پاؤں نہیں پکڑے۔ میرا دل کیوں اس کے اندر سما جانے کو نہیں چاہتا۔ میرا دل کیوں اس کے پیار میں نہیں بھیگتا۔ میرا ذہن سارا وقت گزری یادوں سا بھرا رہتا ہے۔

سلام اللہ کو ہمیشہ کی طرح زہرا کی بات بُری لگی تھی، اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ جس زمین کے اندر انہیں زبردستی دھکیل دیا گیا ہے۔ ضرور اُس سے اُن کا ناتا بڑا گہرا اور مضبوط ہوگا۔ اور یہ گھر گھاس پھونس کی جھونپڑیوں اور ان میں کوئی زیادہ فرق تو نہیں تھا۔ دونوں ہی ناپائیدار۔ ہواؤں کی زد میں لرزاں اور کمزور پھر بھی پناہ گاہیں اور یہاں آکر اس نے تو پینٹ بوشرٹ بھی پہن لی تھی اور چوری چھپے نشہ بھی کرلیتا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتے بھی تھے۔ پھر زہرا نہ جانے کون سی یادوں میں کھوئی رہتی ہے۔ شک بھرا دل ویران ہی تو رہتا ہے۔ ''ہجرت ہمارے ایمان میں شامل ہے۔ ہمارے

بزرگ سلام اللہ نے اُسے قائل کرنا چاہا۔

میں جانتی ہوں۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لیکن صرف ہم ہی کیوں۔ ہم ہی کیوں برباد ہوئے۔ زہرا کی آنکھوں میں یاد کی چبھن سے آنسو نکل آئے۔

ہم اکیلے تو نہیں ہیں۔ دیکھو اس بستی کو، گھروں میں سوئے لوگوں کو، اس بستی میں پھرنے والے کتوں کو۔ وہ سب ہمارے ساتھ ہیں سلام اللہ نے اندھیرے میں زہرا کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہاں کی ہواؤں میں نم نہیں۔ دھول ہی دھول۔ سمندر کہاں ہے اور بارش۔ اور پٹ سن جس کو میرے بابا گوٹ کر ریشے بنایا کرتے تھے“۔ زہرا ہمیشہ کی طرح برسوں پیچھے لَوٹ گئی۔ تو وہ زندہ ہی گزرے دنوں میں تھی۔

اور سلام اللہ کا دل بھی محرومی کی کسک سے بھر گیا۔ لیکن پھر بھی وہ مرد تھا۔ حالات میں ڈھلنے والا۔ عملی انسان۔ خوابوں اور یادوں سے دُور۔

نرمی سے اُس نے زہرا کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولا۔ زہرا ہم بھی ایک

دن اپنا گھر بنالیں گے۔ تم اور میں اس کی آواز میں امید کی تازگی اور پیار کا رنگ تھا۔

''اور پھر کوئی بڑی طاقت ہمیں یہاں سے بھی دھکیل کر کہیں اور جانے پر مجبور کردے گی''۔ زہرا کے اندر کی ساری بے یقینی اس کی آواز میں در آئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ علیحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اس کے آگے کچھ نہیں۔ صرف موت ہو سکتی ہے''۔ سلام اللہ نے ہولے سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا۔ اسے ابھی زہرا کا اور انتظار کرنا ہوگا۔ پھر زہرا بھی کھڑی ہوگئی۔ وہ دونوں چپ چاپ رات کی آوازوں میں گِھرے کھڑے رہے تھے۔ اور سیاہ بادل اور بھی سیاہ ہو گئے تھے۔ اور سڑکوں کے کنارے بنے اُجاڑ پارکوں میں اُگی خودرو جھاڑیوں میں ہوا آواز پیدا کرتی گزر رہی تھی اور یہاں سیاہ بادل اب بھی زہرا کو گھیرے ہوئے تھے۔ بھوک اور بے چارگی کا جان لیوا احساس اس کے اندر جاگ رہا تھا۔ بھوک جو اس کے اندر سے اُٹھ کر اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ بازار کی رنگا رنگ بوؤں میں ڈوبی۔ زیادہ تکلیف دہ۔ لیکن اُسے اس کو برداشت کرنا

ہو گا۔ صرف انتظام۔ لامتناہی۔ کرب میں ڈوبا ہوا۔ اچھے وقت کا۔ اچھی روٹی کا۔ ماں کے تندرست ہونے کا۔ ان اونچی اونچی پختہ دیواروں اور شوروغوغا کے درمیان کھڑے اسے ایک اور شور سنائی دینے لگا۔ جو اس کے اندر بھی اٹھ رہا تھا۔ تیز اور شانت۔ مدھم اور دھیما۔ سمندر کا۔ بارش کا۔ سمندر میں بہتی کشتیاں اور دُور کنارے پر اس کا اپنا جھونپڑا۔ ایک گھر اُسے کے اندر سے اُٹھتا دھواں۔ بھات اور مچھلی۔ اسے لگا جیسے جھونپڑے کے اندر سے بھات اور مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو اُٹھ رہی ہو۔ اور وہ ماں سے کہہ رہی ہو۔ ماں بھوک لگی ہے۔ اور ماں نے اسے تھالی بھر چاول ڈال کر دے دیئے ہوں۔ اور پھر آوازیں گہری ہو گئیں۔ اپنی اپنی سی باس اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ دور سمندر میں کوئی بڑی سی کشتی میں جال پھینکتے ہوئے گا رہا تھا۔ سُر لہروں پر بہت اس تک پہنچ رہا تھا۔ اور اس کا باپ تالاب کے کنارے پٹ سن کے ریشو کو کوٹ رہا تھا۔ اس کا سانولا جسم کرنوں کی زد میں چمک رہا تھا۔ بہت سارے لوگوں کے درمیان بھی اسے صرف اپنا باپ ہی اچھا لگتا۔ اُسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرتا۔ ہوا سمندر۔ آگے ہی آگے بڑھتا رہتا۔

آوازیں لَوٹ لَوٹ کر آتی رہیں۔ اللہ میگھ دے۔ پانی دے۔ سایہ دے رہے توئی۔ ہماری زمین آنسو اور بادل۔ پانی اور زرخیزی۔ سفر اور آبادی۔ شاید سفر ہی سفر۔ جب لاہور میں ایک بڑے وسیع میدان میں اس نے کھڑے ہو کر دیکھا تو سپاٹ آسمان اور گرد آلود دھرتی اسے گھیر رہی تھی۔ دُور درختوں کے گرد آلود پتوں میں چھپی چڑیاں شور ڈال رہی تھیں۔ اور سُورج کا سرخ گولا درختوں کے تنوں میں اُلجھا نیچے اُتر رہا تھا۔ اُس کا دل دکھ اور محرومی میں ڈوبنے لگا تھا میری دھرتی کیا ہوئی وہ خود سے پوچھ رہی تھی وہ ایک ہجوم میں۔ گِھری بھی خوفزدہ ہو اٹھی۔ یہ کیسی دھرتی تھی۔ جہاں صرف چڑیوں کا شور ہی ہے۔ دوسری آوازیں جن سے اس کے کان مانوس تھے۔ کیا ہوئیں۔ لہروں کے شوریدہ سرشاں شاں۔ ناریل کے بلند درختوں سے لٹکتے ہوئے ناریل اور خودرو جھاڑیوں کے گہرے مونگیا سائے۔

کوئی چیز اس کے دل میں سَن سَن کر کے گُھس رہی تھی۔ اتنے سارے ہجوم میں بھی اکیلے رہ جانے کا خیال۔ اُس نے جھک کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔ دھول میں سے پاؤں اُسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ شاید پھر سب

طرف اندھیرا چھا گیا۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ تینوں اس خیمے سے باہر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ جواب اس کا گھر تھا۔ وہ شفق کی اس آخری سرخی کو دیکھ رہے تھے۔ جو آسمان کے بیچوں بیچ ایک ننھے سے بادل کو رنگ رہی تھی۔ اُمید کی ڈوبتی کرن کی طرح۔

دن نکلتے اور ڈوبتے رہے۔ اس کا بابا شام کے وقت سب کے ساتھ بیٹھا گزرے دنوں اور چھنی دھرتی کی باتیں کرتا رہتا۔ وہ سب ابھی بھی ایک خواب دیکھ رہے تھے۔ واپس جانے کا خواب حالانکہ وہ جانتے تھے اس دھرتی نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن وقت دھیرے دھیرے کھسکتا رہا تھا۔ آسمان اور زمین ہولے ہولے قدم دھرتے ان کے دل میں اُترتے رہے اور پھر وہ سب اسی زمین سے اپنی وابستگی کو گہرا کرنے کی کوشش میں روزگار کی تلاش میں سارے شہر میں بکھر گئے۔

رات کو جب زندگی کی تیز آوازیں تھم جاتیں تو زہرا یادوں کی گہرائیوں میں ڈوبی دور بہت دور انجانے ساحلوں پر اُتر جاتی۔ اس کا ذہن اور دل۔ اسے نم آلود ہوا اور تیز بارش کی پھوار میں بھگوتا رہتا۔ اور اسے لگتا

جیسے وہ بھی کسی کشتی میں بیٹھی گا رہی ہو۔ وہ آنکھیں بند کرلیتی اور پھر اس کے گرد پھیلی ویرانی گہرے مونگیا سایوں والی زمین میں ڈھل جاتی۔ جو اس کی تھی صرف اس کی۔ اس کے اپنے بطن میں جذب کرتی ہوئی دھرتی۔ اللہ میگھ دے سایہ دے رے پانی دے رے توئی۔ اللہ میگھ دے۔ اللہ میگھ دے۔ اور پھر ایک لمبی بیماری نے اُس کے بابا کو نگل لیا۔ تب اُسے آسمان پر دہکتے سورج کی تپش کا اندازہ نئے طور سے ہوا۔

ایک روز خالہ آمنہ نے اس کی ماں کو کہا تھا۔ تو زہرا کو ہمارے ساتھ پنسلیں بیچنے کو بھیج دیا کر۔ حکومت کے روپے ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ زندگی بڑی گراں ہوگئی ہے۔

اس کی ماں نے خوف بھری نظروں سے زہرا کو دیکھا اور کہا۔ نہیں آمنہ۔ میں جوان لڑکی کو بازار میں سودا بیچنے کو نہیں بھیجوں گی۔ اور وہ نڈھال سی ہوکر لیٹ گئی۔ شاید وہ میرے حالات سے آنکھیں موند لینا چاہتی تھی۔

لیکن جب روپے ختم ہوگئے تو زہرا ماں سے پوچھے بغیر ہی آمنہ خالہ کے ساتھ آگئی۔ اس نے سوچا تھا جب ماں بھی نہ رہے گی تو پھر میری

حفاظت کون کرے گا۔کون میرے بارے میں فکر مند ہوگا۔

بازار میں کھڑے اُسے ایک اور بازار یاد آ گیا۔لیکن اب ساری یادیں دھندلا سی گئی تھیں۔آتے جاتے لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دکانوں پر کام کرنے والے بچے۔ دوپٹے سُکھاتے لڑکے۔ سودا بیچتے چھابڑیوں والے مرد جواُسے دیکھ کر خواہ مخواہ مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

اس نے آمنہ خالہ کا پلو پکڑ کر کہا تھا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے اتنے لوگوں کی نظروں میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔آؤ گھر چلیں۔

اور بھوکا رہنا اچھا لگتا ہے کیا۔میں نے بھی پہلے ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن میں تمہیں کیا بتاؤں۔اس بھرے بازار میں۔تم زیادہ محفوظ ہو۔کوئی زبردستی پکڑ نہیں سکتا۔لیکن کوٹھیوں کے صاحب لوگ۔اور آمنہ کے زور سے زمین پر تھوک دیا۔اور مختلف چیزوں کو اکٹھا کر کے باندھنے لگی جن میں مرغیوں کے سر اور پنجے۔مچھلیوں کی دُمیں اور بڑے گوشت کے چھیچھڑے تھے۔اس نے سر اوپر اٹھایا تو سامنے کھڑا ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اُسے گھور رہا تھا۔اس کا جی چاہا وہ بھاگتی ہوئی اپنے خیمے میں جا کر چھپ

جائے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسلوں کو دیکھا۔ اور اسے لگا جیسے وہ بھی ایک پنسل ہو جسے مرد بغیر پیسے دیئے ہی خریدنا چاہتے ہوں۔ اس نے آمنہ کا پلو پھر زور سے پکڑ لیا۔

آمنہ ہولے سے ہنسی۔ پگلی یہ بازار ہے یہاں ہر چیز کی بولی لگتی ہے لیکن یہ تمہاری اپنی مرضی پہ ہے۔

آمنہ کے چہرے پر زمانوں کا تجربہ۔ غمزدہ بصیرت اور بے بسی کی زردی تھی۔ اس کے لب ساری دنیا پر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ اور وہ سارے ہجوم سے بے پرواہ وہاں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اور اسے لگا جیسے وہ اس ایک فقرے کی دیوار پھاند کر دوسری طرف اُترنے سے پہلے عقل کی کئی منزلیں پار کر گئی ہو ہاں یہ بازار ہے۔ یہاں ہر چیز کی بولی گتی ہے۔ لیکن یہ تو اپنی مرصی ہے۔ اُس نے آمنہ کا پلو چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گئی۔

بابو جی پنسل خریدو گے۔ وہ ہولے سے مسکرائی۔ اس کا سانولا چہرہ عجیب سی جوت سے روشن ہو گیا تھا۔ اور جب وہ شام کو سب کے ساتھ گھر

پہنچی تو اسے لگا جیسے اپنی لڑکی ہونے کے بوجھ کو اس نے اٹھا کر کہیں پاتال میں پھینک دیا ہو۔ پیسے گنتے ہوئے اسے صرف دال بھات کی خواہش یاد تھی۔ جو اس کی ماں نے اس کے سامنے رکھا تھا۔ لیکن بازار میں کھڑے مختلف نظریں اُسے اس بات کی یاد دلاتی رہتیں۔ وہ گھبرا کر ساڑھی کو اپنے گرد لپیٹ لیتی۔ ہاں مجھے صرف پنسلیں بیچنی ہیں۔ صرف پنسلیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی گرفت اور سخت کر دیتی۔

لیکن وہ جان گئی تھی کہ لوگ پنسلوں سے زیادہ اس کے جسم کو للچائی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اس کے سانولے چہرے کی دہکتی جوت انہیں پُر کشش لگتی۔ اور پیسے دیتے ہوئے مرد مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ رسان سے سر جھکا لیتی اور آگے بڑھ جاتی۔ اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ۔ زندہ رہنے کی تگ و دو کی طرف لیکن جب رات کو وہ سونے کی کوششیں کرتی تو دن بھر کی دیکھی ہوئی نظریں اس کے گرد اکٹھا ہو جاتیں۔ اور اس کے جسم کے اندر گہرا اُتر جاتیں۔ وہ بے چین ہو جاتی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ مسکرانے کی کوشش کرتی لیکن

دہشت زدہ کرنے والا احساس اس کے اندر کلبلانے لگتا۔ اسے لگتا جیسے وہ بھی دروپتی ہو۔ اور اس کے دشمن اس کا دامن پکڑ کر اُسے عُریاں کرنا چاہتے ہوں۔ وہ اُٹھ کر باہر آ جاتی۔ چاند ٹھٹھری رات میں اکیلا اور اداس سا محو سفر ہوتا اور دھند کی ہلکی سی تہہ خیموں کے گرد چھائی ہوئی تھی۔ اسے ہمیشہ کی طرح سمندر میں بہتی اکیلی کشتی یاد آ گئی۔ میں گزری باتوں کو بھول کیوں نہیں جاتی''۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اور وہ جانتی تھی اسے زندہ رہنا تھا۔ ماں کے لئے۔ اپنے لیے۔ اور وہ مرنا بھی تو نہیں چاہتی تھی۔ ہوا کو محسوس کرنا اور روشنی میں آنکھیں کھولنا کتنا اچھا لگتا تھا اور اب یہ بادل۔ اور بارش کے تیز سُرمئی جھکڑ جو دیواروں سے اور سڑک کے فرش پر سر پٹک رہے تھے۔ اور وہ بازار میں کھڑی تھی۔ بے چارگی کا احساس پھر اس کے گرم وجود سے اُٹھ کر اسے یخ کرنے لگا۔ نہ جانے وہ کیوں لوگوں کے درمیان پھرتی پھرتی اکیلی ہو جاتی۔ مسکراتے مسکراتے غمزدہ ہو جاتی۔ اور پنسلیں ہاتھ میں پکڑے کھو جاتی۔ اسے لگتا وہ چھوٹی سی بچی ہو جو زمانے کے سمندر میں اکیلی ہی کنارے تک پہنچنے کے لئے تیر رہی ہو، ڈوب رہی ہو، اس نے ہمیشہ کی

طرح اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔ دنیا میں کتنے مرد ہیں۔ مرد ہی مرد، ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گندے مذاق کرتے ہوئے۔ اس کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتے ہوئے لیکن پھر بھی کوئی اس کا نہیں۔ زندگی کے یہ گزرے سال۔ اسے کسی چیز کی کھوج تھی۔ لیکن اسے سمجھ نہ آتا تھا کہ کھوج کہاں سے شروع کرے۔ اس کے اندر سب کچھ بے یقینی میں ڈوب جاتا۔ سلام اللہ کا چہرہ جو موٹر گیراج میں کام کرتا تھا۔ اور رات کو نہ جانے کہاں سے پی کر آتا تھا۔ یا فیروز جو اُسے دیکھ کر سرخ چہرہ کئے مسکرانے لگتا۔ لیکن بغیر منت کئے کبھی گوشت کی دو زائد بوٹیاں بھ نہ دیتا۔ یا اور چہرے۔ چہرے ہی چہرے۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں بہت عرصے بعد آنسو اکٹھے ہو رہے تھے۔

میرا اور دھرتی کا رشتہ ٹوٹ کیوں گیا ہے۔ وہ تو اُسے رشتے کو اُسی طرح استوار کئے رکھنا چاہتی تھی۔ وہ زمین کیا ہوئی جس پر میرے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ جہاں میں اوپر اُٹھ رہی تھی۔ بڑھ رہی تھی۔

لیکن یہ دھرتی'' سفر کے کتنے مقام تھے۔ وہ ان مقاموں سے گزر کر اس ہجوم میں گھر گئی تھی۔ جس کا حصہ وہ بن نہ پائی تھی لیکن پھر بھی گھری ہوئی تھی۔

صبح ہی اس نے بڑے گوشت والے فیروز سے گوشت مانگا تھا۔

اس نے کہا تھا'' دونا مجھے بھی۔ ابھی تم نے خالہ آمنہ کو دیا ہے۔ اور وہ ساری بہاری عورتیں امید بھری نظروں اور زرد چہروں کے ساتھ فیروز کو دیکھتی رہی تھیں۔ وہ سب زہرا کی ان طاقتوں سے آگاہ تھیں۔ جن کی وجہ سے فیروز ان سب کو بھی چھیچھڑوں میں ایک آدھ گوشت کی بوٹی بھی ڈال دیتا تھا۔

اور جب وہ زہرا کی ہتھیلی پر گوشت رکھنے لگا تو اس نے جان کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سرخ چہرہ کیے مسکرانے لگا تھا۔ زہرا کو اپنا آپ بڑا احمق لگا۔ لیکن زندگی کی ضرورتیں۔ وہ مسکرائی اور جلدی سے سب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ جانتی تھی سب کچھ پیچھے چھپ گیا تھا، اور شاید سلام اللہ کا جذبہ بھی۔ صرف رحم تھا۔ اپنے گرد پھیلے لوگوں کی نظروں کا رحم۔ سلام اللہ کا رحم۔ حکومت کا رحم۔ اور وہ اس رحم کے سیاہ سمندر میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی تگ و دو میں نڈھال ہو گئی تھی۔

پھر بادل زور سے گرجے اور بارش کے بڑے بڑے قطرے گرد آلود سڑک پر دائرے بنانے لگے۔ تیز بوچھاڑ میں ردی کاغذ آگے ہی آگے سفر کر رہے تھے۔ ''اندر آجاؤ بھیگ جاؤ گی''۔ فیروز نے اسے آواز دی۔ وہ اندر آ کر کھڑکی کے پاس پڑے بنچ پر بیٹھ گئی۔

اللہ میگھ دے۔ لیکن وہ دھرتی کہاں سے لاؤں''۔ وہ بارش کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اداس ہو رہی تھی۔ لوگ برآمدوں میں کھڑے سیاہ بادلوں اور تیز سرمئی بوچھاڑ کو دیکھ رہے تھے۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کے درمیان بیٹھا فیروز اس کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں گڑی سی ہو گئیں۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کیوں آج پنسلوں کی بجائے جسم بیچو گی۔ ہم تینوں بڑی قیمت لگائیں گے بڑا مال ملے گا''۔ وہ مسکرا رہے تھے اور زہرا کو لگا جیسے وہ تیز چھری سے اس کی ہڈیوں سے گوشت علیحدہ کر کے ٹانگ رہے ہوں۔ بیچنے کے لئے۔ بازار میں سجانے کے لئے۔ اسے مٹانے کے لئے۔ شاید زندگی کی خوشیاں۔ اس نے ایک ساعت کو سوچا۔ اس نے

خاموشی سے دروازے کو دھکیلا۔ اور بارش کے تیز بگولوں میں باہر آ گئی۔ سیاہ بادل بہت نیچے اترتے لگ رہے تھے۔ زہرا کے جسم کی ساری طاقت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ مارکیٹ کے برآمدے میں بھیگتی ہوئی خالہ آمنہ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ فیروز کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ سڑک پانی میں ڈوب گئی تھی۔ دکاندار چھابڑیوں والے اور اکا دکا خریدا خاموش کھڑے بارش کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن زہرا کو لگ رہا تھا جیسے سب طرف دہکتا الاؤ ہو جو اُسے جلا ڈالنا چاہتا ہو۔ لیکن وہ تو زندہ رہنا چاہتی تھی۔

اور پھر بادل چھٹ گئے۔ نکھرا اور اُجلا آسمان بھیگی ہوئی زمین پر جھانکنے لگا۔

زہرا ہمیشہ کی طرح اپنی ساتھی عورتوں اور بچوں کے ساتھ بس پر سوار ہوکر اپنی بستی کو چل پڑی۔ اس کا سارا اعتماد جو اس نے زندگی کے تجربوں سے حاصل کیا تھا۔ کہیں پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ اس سے چھن گیا تھا۔

رات جب اس نے سلام اللہ کو دیکھا تو وہ پہلی بار دل کو پوری سچائی سے مسکرائی۔

’’سلام اللہ ہمیں بھی اب ایک گھر الگ سے بنانا پڑے گا‘‘۔ اور سلام اللہ نے ہمیشہ کی طرح اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور زہرا کو لگا جیسے اس دھرتی نے آگے بڑھ کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا ہو۔ نظروں کی تیزی اور غیر یقینی حالت سے بچا لیا ہو۔ فیروز کی نظریں۔ غیر مردوں کی نگاہیں۔ سب کچھ اور بہت سی یادوں میں گڈمڈ ماضی کی دُھند میں ڈوب رہا تھا۔ صرف وہ اور اسلام اللہ اس دھرتی کے ٹھوس وجود پر کھڑے زندہ اور لازوال لگ رہے تھے۔

زہرا کو پہلی بار اپنے گھر کے تصور کے ساتھ اس نئی دھرتی کی محبت بھی اپنی روح میں سرایت کرتی ہوئی لگی۔ اسے لگا جیسے اس نے اپنے وجود کا نیا پودا بودیا ہو۔ اور وہ بڑھ رہا ہو۔ بڑھتا ہی جا رہا ہو۔ اور وہ سوچ رہی تھی۔ اس زمین پر میرا گھر ہوگا۔ میرا اپنا اور رات تاروں کی جھانجھر پہنے ان کے گرد ناچنے لگی۔ آج اس نے پہلی بار ان آوازوں کو سُنا تھا۔ جو صرف اس زمین سے وابستہ تھیں۔ خودرو جھاڑیوں میں سرسراتی ہوا اُسے اپنی سی لگی۔ اور زمین کی سُوندھی سُوندھی باس تھی۔ باس جو صرف اپنی دھرتی سے اُٹھتی ہے۔

وجود کا سچ

چودھری حاکم خاں کے جنازے کو کندھا دیئے وہ قبرستان تک گیا
تھا لیکن جب جسم کو لحد میں اتارنے کا وقت آیا تو حاکم خاں کے اپنوں نے
اسے آگے بڑھنے نہ دیا۔ اور وہ سر جھکائے ایک طرف کھڑا اس ویرانی کو
دیکھنے لگا جو ٹوٹی پھوٹی قبروں اور خودرد کانٹے دار جھاڑیوں میں سے جھانک
رہی تھی۔ پھر لوگ پچھلے قدموں چلتے ہوئے گاؤں کو جاتی پگڈنڈیوں پر مڑ
گئے لیکن وہ وہیں کھڑا، ایسے گناہ گار کی طرح جس کو اپنے جُرم کی پوری شدت

اور نوعیت سمجھ ہی نہ آ رہی ہو، ان کو جاتے دیکھتا رہا۔ کسی نے آواز نہ دی۔ کسی نے اسے ساتھ چلنے کو نہ کہا۔ لوگوں نے اسے اپنے سے الگ کر دیا تھا۔ چودھری حاکم خاں کا اور اس کا رشتہ شاید بنتا ہی نہ تھا، حالانکہ حاکم خاں نے ایک روز پہلے ہی اس کی اپنی بیٹی سے نکاح پڑھوایا تھا۔

حاکم خان کا سفید شملہ جھکا ہوا تھا اور اس کی جُوتی گرد آلود تھی۔ اس کے چہرے پر زردی تھی۔ مولوی کو بند مٹھی میں روپے دے کر رخصت کرنے کے بعد وہ ان دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے صابراں کے سر پر ہولے سے ہاتھ رکھا اور پھر بڑے سے صحن سے ہوتا ہُوا حویلی کے اندر چلا گیا۔ وہ دونوں وہیں کھڑے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ نہیں تھامے تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہیں جھانکا تھا، اور رحمت علی کو لگا تھا جیسے وہی ویرانی اس کے چاروں طرف چھا گئی ہو۔ جس کی موجودگی کو وہ ہمیشہ محسوس کرتا آیا تھا۔ اور چودھری۔ چودھری کی ذات ہی تو تھی جس کو اس نے اس تمام بے خبری میں بھی پوری طرح جانا تھا۔ وہ صرف چودھری کو جانتا تھا۔ لیکن پھر صابراں نہ جانے کیسے اس کے

گرد چھائی گہری دُھند میں گھس کر اسے باہر نکال کر ایک اور ہی دنیا میں لے آئی۔

اسے اس دنیا کی بھی پوری طرح سمجھ نہیں تھی۔ وہ تو صابراں کے بولوں کو سننے کی کوشش میں اسے دیکھتا رہا اور اس کے ہلتے لبوں کی جنبش اس کے دل میں اُتر کر اس کے سارے وجود کو ہلا ڈالتی اور سارا دن کام کرتے ہوئے صِرف دو ہلتے لب اسے دکھائی دیتے رہے۔

لیکن کل جب صابراں اور وہ پاس پاس کھڑے تھے، اسے صابراں کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا، وہ صرف چودھری کے جھکے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار بھی چودھری نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اسے ایک بار بھی پاؤں کی ٹھوکر نہیں ماری تھی۔ اور رحمت علی کو لگا جیسے وہ بے سہارا ہو گیا ہو۔ صابراں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پاس پڑی چارپائی پر بیٹھ کر بولی: ''اچھا تھا میاں جی کچھ تو بولتے۔ کچھ تو کہتے ہم دونوں کو''۔ اور رحمت علی کو ''ہم دونوں'' کے الفاظ عجیب لگے۔ کیا ہم دونوں ایک ہیں۔ بے یقینی اور خوف کی کیفیت نے پھر اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

چودھری، میں اور صابراں۔ صابراں بی بی۔ چودھری حاکم خان کی بیٹی اور میں۔ اور چودھری۔ اور پاؤں کی ٹھوکریں اور بھینسوں کے باڑے کی اندھیری کوٹھڑی۔ اور لامتناہی سیاہ اکیلی راتیں جو نہ جانے کب شروع ہوئیں تھیں اور کب ختم ہو گئیں۔

کل رات ابھی کل ہی تو تھی۔ اور آج حاکم خان کے جسم کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اور پھر نم آلود مٹی۔ اور راہوں اور اُڑتی دھول۔ اُس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ اور اسے لگا وہ تو کچھ بھی نہیں صرف دھول ہے جو چودھری حاکم خان اپنے پاؤں سے اُتار کر چلا گیا ہو۔

کل رات وہ دونوں خاموش ایک دوسرے کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ پھر صابراں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ''تو پھر اپنے آپ کو بھولنے لگا ہے رحمت علی۔ جو کچھ ہُوا۔ اچھا ہی ہوا۔ اور اگر نہ بھی ہوتا تیرے میرے لئے کیا فرق پڑتا۔ میں سارے ناتے توڑ کر ہی تو تیرے ساتھ گئی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے اگر اس دنیا میں کچھ ہے تو صرف تُو ہے۔ تیرے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تُو ہنستا کیوں نہیں۔ دیکھ میں آج تیری ووہٹی بن

گئی ہوں کیا تو خوش نہیں۔ تُو ہنستا کیوں نہیں۔ ہنس رحمت علی‘‘۔ اور رحمت علی نے ہنسنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن لگا جیسے چودھری زور زور سے اسے ٹھوکریں مار رہا ہو اور اس کا سارا وجود دل سمیت درد کر رہا ہو۔

اس کوٹھری کے باہر سنسان گاؤں میں مگھر کی ہوا کہریلی دھند میں لپٹی بوجھل قدموں سے چل رہی تھی۔ اور دُور کھیتوں میں گیدڑ ہُو ہُو کی آواز نکالتے بڑے دُکھی لگ رہے تھے۔

صابراں نے اسے چارپائی پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا اور دروازہ کھول کر دہلیز میں کھڑی ہو گئی۔ اوپر دُھند میں لپٹا چاند ویران ٹکڑے کی طرح بے رنگ تھا اور تارے راکھ میں دبی چنگاریوں کی مانند بُجھے ہوئے لگ رہے تھے۔ صابراں نے اپنا سر چوکھٹ سے لگا دیا اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگ۔ رحمت علی نے بھی اپنی بھیگی پلکوں پر بازو رکھ کر کروٹ بدلی تھی۔ چاند اس کی پُشت کے پیچھے ڈوب گیا تھا۔

صبح جب وہ جاگے تو حاکم خان کی حویلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے حاکم خان نے خودکشی کر لی! رحمت علی نے اپنی پگڑی کھول

کر گلے میں ڈال لی اور برہنہ پاؤں دہلیز میں کھڑا ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اونچی آواز میں روئے یا یونہی آنسوؤں کو اپنے گالوں پر بہنے دے۔ صابراں نے لمبا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا اور دوڑتی ہوئی ہجوم میں گھس کر میاں جی کے پاؤں کے پاس بیٹھی اپنے سر کو زمین پر ٹیک رہی تھی۔ رحمت علی کو لگا جیسے ہمیشہ کی طرح وہ پھر اکیلا ہو ہی رہ گیا ہو۔ صابراں بھی اسے ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے کر نہیں گئی۔ اور اس نے تو زندگی کو اونچ نیچ کو پار کرنا ہی صابراں سے سیکھا تھا، اس کی اپنی ذات تو کوئی بھی نہیں تھی۔

برادری کی پنچایت نے فیصلہ کیا کہ پولیس تک بات نہ پہنچے۔ لوگ آتے، دبی زبان سے باتیں کرتے، خاموشی سے پھوڑی پر بیٹھ جاتے۔ رحمت علی کو اتنے زیادہ لوگوں کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔ اور صابراں بھی اس سے دُور حویلی کے اندر سینہ کوبی کرتے نڈھال ہو چکی تھی۔

''صابراں کو میرے پاس رہنا چاہیے تھا۔ صابراں مجھے راہ کیوں نہیں دکھاتی''۔ رحمت علی کے اندر کا ڈر سیاہ ہیولے کی مانند اسے بڑا ڈراونا لگ رہا تھا۔ بَین کی اُٹھتی دل خراش چیخیں۔ اس نے آگے بڑھنے کے لئے۔

قدم اُٹھائے لیکن اسے تو صابراں کے بغیر چلنا ہی نہ آتا تھا۔ وہ کہاں جائے، کیسے چلے۔

اور اب وہ چودھری کی قبر کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ پگڑی اب بھی اس کی گردن میں اُلجھی ہوئی تھی اور مگھر کا سورج افق کی دھندلی گلابیوں میں بہت دُور کہیں درختوں کے تنوں میں پھنسا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ کھیتوں کے اوپر بھی دھند کی ہلکی چادر چھا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر چودھری کی قبر کو دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا اسے اس قبر کے پاس بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ چودھری جی۔ وہ صابراں کی طرح ہی بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور اس کے اندر کی پشیمانی گرم آنسوؤں کی طرح اس کے سارے وجود کو بھگو رہی تھی، اُسے راکھ بنا رہی تھی۔ بھسم کر رہی تھی۔ وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ تو کبھی تھا ہی نہیں۔ صِرف صابراں کو نظر آتا تھا اور صابراں نے کہا تھا ''کتنی عجیب بات ہے۔ رحمت علی مجھے لگتا ہے تو سچ نہیں بلکہ میری سوچوں سے پیدا ہوا آدمی ہے، اور وہ زور سے ہنس پڑی تھی۔

رحمت علی نے ہولے سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بھی اپنے ہونے پر

شک ہونے لگا تھا۔ صابراں بھلا غلط کس طرح کہہ سکتی ہے۔ اس نے دل میں کہا تھا اور اسے اپنے آپ سے ڈر آنے لگا تھا۔

اور وہ تھا بھی صابراں کی سوچوں کا پیدا کیا ہوا آدمی۔ صابراں کی خواہش کا مجسم ہیولیٰ۔ اسے اپنے ہونے کا احساس بے خبری ہی میں ہوا تھا جیسے وہ صدیوں کی نیند کے بعد جاگا ہو۔ اسے اپنا آپ عجیب سا لگا تھا۔ جیسے وہ کوئی اور ہو جو اس کے باہر کھڑا ہو۔ استہزا آمیز نظروں سے گھورتا ہوا وہ خوفزدہ ہو جاتا۔ جیسے صابراں پوچھ رہی ہو؟ اگر صابراں نے بھی نہ پہچانا ہو"۔ اس نے صابراں کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا اور کہا "اگر میں بھی کوئی وا ورولا ہوا تو۔ تو پھر کیا ہوگا؟" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"کیا ہوگا؟ تو کھیتوں میں نکل جائے گا اور میں بھی تیرے پیچھے بھاگتی جاؤں گی"۔ صابراں بے طرح ہنس رہی تھی۔ اور اس کے سفید دانت کپاس کے پھولوں کی طرح رات کے ملگجے اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ اس کا سارا وجود پُرا میں ملتی گندم کی بالی کی طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

"ارے جھلّے تو ہر بار اپنے بارے میں شک میں کیوں پڑ جاتا ہے؟"

صابراں نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا۔ ''اگر تو کوئی نہیں تو میں کس سے باتیں کرتی ہوں؟ کس کے پاس روز آتی ہوں؟ کوئی تو ہے نا؟ اور وہ کوئی تو ہے صرف تو'' ! وہ بھی ہنسنے لگا اور ان دونوں کے سروں پر ٹھہرا چاند بھی ہنسنے لگا تھا۔ اور ہوا گندم کے کھیتوں میں گھُسی خواہ مخواہ تال دیتی ان کے گرد ناچ رہی تھی۔ ناچتی ہی جا رہی تھی۔

فطرت کے ناچ کی ابتدا اس روز ہوئی تھی جب چودھری کے گھر کی ڈیوڑھی میں صابراں کے ہاتھ کی انگلیاں اس کے وجود سے چھوئی تھیں۔ وہ چودھری کے گھر کی ڈیوڑھی میں برسوں سے اکیلا سوتا آیا تھا۔ رات کی تنہائی میں اسے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ اس روز بھی وہ بیٹھا کڑوے تمباکو کا گاڑھا دھواں نکالتے ہوئے ساتھ کی کوٹھری میں جگالی کرتی تندرست اور جوان بھینسوں کے تیز سانسوں کی آواز سنتا ہوا رات کی سیاہی میں ڈوبے ہوئے تاروں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ صابروں آ کر بولی ''رحمت علی کیا یہ تم ہی ہو؟'' صابراں کی آواز میں ارتعاش تھا کسی نازک سے جذبے کی بازگشت تھی جسے وہ سمجھتا بھی نہیں تھا۔ وہ آواز کو پہچان گیا اور حقے کی نے اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ’’بس ڈر گئے؟‘‘ نرم ہی ہنسی گونج اُٹھی اور اسے لگا جیسے روحیں صابراں کے وجود سے نکل رہی تھیں۔ ’’رحمت علی میں آج ایک قصہ ساری روحیں صابراں کے وجود سے نکل رہی تھیں۔ ’’رحمت علی میں آج ایک قصہ سُنا ہے۔ لوہے کے آدمی کا! جو چل سکتا تھا، بول سکتا تھا۔ بالکل تمہاری طرح!‘‘ وہ ہولے سے ہنسنے لگی۔ ’’کتابوں میں بھی اس کی ساری تفصیل لکھی ہوئی ہے‘‘۔

’’کیوں آئی ہو صابراں بی بی، اس اندھیرے میں اتنا لمبا صحن پار کر کے؟‘‘ اسے صابراں بی بی کی ہنسی کا مطلب سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ یوں مغرب کے بعد اس کے پاس آنا کوئی اچھا کام نہ تھا۔ بی بی۔ بڑی بی بی ناراض ہو گی‘‘۔ یہ دیکھنے آئی تھی رحمت علی کہ وہ لوہے کا آدمی کہیں تم تو نہیں ہو؟‘‘ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ جیسے بُرا مان گئی ہو۔ ’’صابراں بی بی لوہے کا آدمی میرے جیسا تھا کیا؟‘‘ ’’نہیں وہ اصلی لوہے کا تھا۔ اس کے بارے میں سُن کر مجھے ایسا لگا جیسے وہ تم ہو! میری ہنسی نکل گئی۔ بی بی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ وہ لوہے کا آدمی تمہاری طرح ہی بغیر آنکھوں کے چل رہا

تھا، بول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نہیں تھیں اور مجھے لگا جیسے تمہاری بھی آنکھیں نہ ہوں''۔ ''لیکن میں تو دیکھ سکتا ہوں۔ میں اندھا تو نہیں''۔

رحمت علی کی آواز میں حیرانی اور خوف تھا۔

صابراں زور سے ہنسی۔ ''لیکن میں نے کبھی تمہاری آنکھیں نہیں دیکھیں مجھے تو وہ نظر نہیں آتیں۔ میں نے ان کو کبھی اپنی آنکھوں میں جھانکتے نہیں دیکھا۔ آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا جاتا ہے۔ رحمت علی اور تو۔ تُو تو ازل کا اندھا ہے!'' تب رحمت علی کو لگا جیسے صابراں بی بی کے اندر سے روحیں نکل کر صابراں بی بی کو ہی چمٹ گئی ہوں۔ تبھی تو وہ اول فول بکنے لگی ہے۔ رحمت علی کو ڈر سا لگا۔ ''چلو بی بی میں تمہیں اندر تک چھوڑ آؤں''۔ اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''راتوں کو اکیلے نہیں پھرتے۔ جن بھُوت راہ روک لیتے ہیں۔ آؤ چلو''۔ وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔

صابراں اس اندھیرے میں خاموش کھڑی ہو گئی۔ اور پھر بولی۔ ''جن بھوت کوئی نہیں ہوتے۔ میں سب جانتی ہوں۔ رہنے دے میں جیسے آئی تھی چلی بھی جاؤں گی۔ میں نہ کہتی تھی تُو دیکھ نہیں سکتا، تیری آنکھیں ہی

نہیں ہیں!" اور پھر اس کے قدموں کو گونج دیر تک اس سنسان اور اکیلی ڈیوڑھی میں گونجتی رہی۔ اس نے نئی چلم بھری اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے گرم تُو اس کے وجود سے اُٹھ کر اسے جلا رہی ہو۔ اس نے ہولے سے اپنے جسم کو چھوا۔ باہر کھیتوں کی سیاہی کے اوپر اُٹھتی سیاہ دُھند میں تارے ٹھٹھرے ٹھٹھرے اور اداس لگ رہے تھے اور درخت سیاہ دیووں کی مانند ڈراؤنے اور ساکت کھڑے تھے اس نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو چھوا اور انہیں ہلا کر دیکھنے لگا جیسے وہ کہیں سچ مچ لوہے کا بنا ہوا تو نہیں۔

اس کے بازو ہل رہے تھے وہ خوش ہو گیا۔ بھلا زندہ آدمی بھی لوہے کا ہو سکتا ہے کہیں؟ پتا نہیں بی بی کیوں آئی تھی اور یہ لوہے کا آدمی۔ اور صابراں بی بی۔

سامنے کھیتوں میں ہوا سرسراتی کماد کے بلند کھیتوں اور سرسوں کی پیلاہٹ بھری سیاہ ہر بادل میں گھسی کچھ کہتی ہوئی لگ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ تیری تو آنکھیں ہی نہیں۔ اس نے جلدی سے کھیس کو اپنے گرد لپیٹ لیا

اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے خوف زدہ سا کھڑا ہو گیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار ڈر لگا تھا۔

یہ صابراں بی بی بھی جھلی ہی ہے۔ رات کے وقت بھی اندھیرے سے نہیں ڈرتی۔ اس نے چلم کو انگلی سے کُریدتے ہوئے زور زور سے پھونکیں مارتا رہا جیسے اپنے اندر کے خوف کو اڑا دینا چاہتا ہو۔ چلم بجھ چکی تھی۔ اس نے مایوسی سے چلم کو حقے پر رکھا۔ اور بھینسوں کی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ بھینسوں نے پہچان کے طور پر سر اُٹھائے۔ ان کے گلے میں پڑی گھنٹیاں زور سے بج اُٹھیں۔ رحمت علی پیار سے ان کے جسموں پر ہاتھ پھیرنے لگا اور ہولے ہولے ان کے ناموں سے پکارنے لگا وہ اپنے دل میں آتے صابراں کے نام کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ تو اس ڈیوڑھی سے آگے کبھی بھی نہیں گیا تھا۔ اور صابراں بی بی تو اس کی پہنچ سے بہت دُور تھی۔ وہ بھینسوں کے تپش دیتے ہوئے جسموں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ میں کون ہوں۔ کون ہے میرا۔ اس کا خوابیدہ سا ذہن اپنی ذات کے تمام اسرار جان لینا چاہتا تھا۔ وہ آج نہ جانے وہ سب کچھ کیوں جان لینا چاہتا تھا جو زمانے کی دُوری سے

بچھڑ گیا تھا۔ یا وہ اپنی راہ بھول کر اس ڈیوڑھی پر آ کر رک گیا تھا۔ اور پھر ساری راہیں مٹ گئیں یا وہ خود مٹ گیا۔

اور یہ صابراں بی بی۔ اور صابراں بی بی۔ اور صابراں بی بی۔ اس نے زور سے اپنے ذہن میں آتے صابراں کے نام کو جھٹک کر ہٹانا چاہا تھا لیکن صابراں کا نام جھولے کی طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

اتنی بڑی دنیا میں یہ ڈیوڑھی ہی تو برسوں سے اس کا گھر ہے اور بھینسوں کے باڑے سے اُٹھتی تیز مانوس بُو! لیکن وہاں کھڑے اس کا ذہن تصور میں ایک اور تصویر کو بنتے دیکھ رہا تھا جو مٹی مٹی سی تھی، راکھ کی مانند بے رنگ جس میں کوئی چنگاری بھی نہ تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ہاں ایک اور کوٹھری بھی تھی۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے بس اتنا یاد تھا جب بھی کبھی وہ رات کو جاگتا تو چھوٹی سی کوٹھری میں بہت سارے جسموں کے درمیان سکڑ کر پڑا ہوتا اور اس کا پیٹ آدھی بھوک رہ جانے پر اندر سے خالی خالی لگتا جیسے بہت سی ہوا اس کے اندر ہی اندر تیزی سے گھومتی جا رہی ہو اور اسے بھی اپنے ساتھ اڑا رہی ہو۔ وہ اپنے گھٹنے پیٹ

میں اندر گھسیڑ لیتا۔ اس کا جی چاہتا ماں کو پکارے، اس سے روٹی مانگے۔ لیکن وہ جانتا تھا ان کی چنگیر میں کبھی روٹی بچی ہی نہیں تھی اور آٹا۔ اس نے کبھی آٹا نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو روٹی کو جانتا تھا۔ اکثر کبھی کبھار جب اس کا باپ چودھری کی حویلی سے رات پڑے گھر آتا تو اس کی ماں خوب لڑتی۔ تب اس کا باپ اس کو خوب مارتا۔ اور وہ سب کوٹھری کے کونے میں سہم کر اکٹھے ہو جاتے یا سنسان گلی میں نکل جاتے۔ اور ماں زور زور سے بین کرتی، گالیاں دیتی۔ ماں کی سسکیاں کبھی کبھار اسے سنائی دے جاتیں۔ ورنہ سیاہی اور خاموشی۔ باہر بھونکتے کتے یا منہ اوپر کیئے روتے گیدڑوں کی منحوس آوازیں سن سن کر اس کا دل اس کے خالی پیٹ میں گرتا ہوا لگتا۔ اور گہری غنودگی میں ڈوبنے تک وہ روٹی کی خواہش میں بے چین رہتا اور ماں کی سسکیاں اس ساری تنہائی میں اس کا سہارا بنتیں۔

ایک روز باپ نے کہا تھا ”میں کہاں سے اتنے کتوروں کا پیٹ پالوں۔ کتیا کی طرح جنے ہی جاتی ہو۔

ماں نے ہنس کر جواب دیا ”لیکن یہ کسی اور کے نہیں، ایک ہی کتے

کی اولاد ہیں اور وہ کتے تم ہو“! اس کے باپ نے ہمیشہ کی طرح اسے مارنا شروع کیا۔ اور ماں کے ماتھے سے سرخ خون کی دھار کوٹھری کی کچی زمین کو بھگوتی رہی۔ باپ نے اپنا کھیس اُٹھایا اور انہیں روتا چھوڑ کر چودھری کے گھر جانے والی راہ پر مڑ گیا۔ اس نے خون کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔

اسے ماں کی آنکھیں یاد آ رہی تھی جن میں کچھ عجیب سی چمک تھی۔ وہ پانی سے ماتھا دھوتے ہوئے ہولے سے ہنسی۔ ”یہ میری اولاد نہیں ایک کتے کی اولاد ہے، میں نے اپنی جوانی غارت کر دی۔ میں نے اس مرد کے لئے اپنا تن من مار دیا۔ جیسے میں عورت نہیں تھی۔ جیسے مجھے مرد مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اب میں بتاؤں گی اسے۔ میں بھی عورت ہوں“۔

اس رات اس نے ماں سے روٹی بھی نہیں مانگی اور چپ چاپ کوٹھری کے کونے میں لیٹ گیا تھا۔ اسے ماں کے ماتھے کا بہتا ہوا خون یاد آ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ خون کوٹھڑی کے فرش کو بھرتا دیواروں تک اونچا اُٹھ گیا ہو۔ وہ ڈر کے مارے ماں کے جسم کے ساتھ چمٹ گیا۔ ماں سوتے میں بھی شاید ہچکیاں لے رہی تھی۔ ماں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ساتھ لگا

لیا۔

اور پھر ماں بدل سی گئی۔ وہ جب کبھی رات کو جاگتا تو ماں نہ ہوتی اور وہ سب کے درمیان لیٹے ہوئے بھی خوف زدہ ہو جاتا اور بھوک کا شدید احساس اسے بے چین کر دیتا۔ میں نہ جانے کب آ جاتی۔ صبح اُٹھتا تو ماں چولہے کے پاس بیٹھی ڈھیر ساری روٹیاں پکا کر چنگیر بھر دیتی۔ جب کبھی اس کا باپ آتا تو پھر بھُو کے سو جاتے۔ شاید اس کی ماں اپنے کھانے پینے کو باپ سے چھپاتی۔ وہ سب ماں کے ساتھ تھے۔ ماں انہیں باپ سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ وہ سب خوش تھے۔

اس روز باپ بے وقت ہی آ گیا تھا۔ اس نے ماں کو بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے دیوار کے ساتھ پٹکا تھا۔ ماں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور چپ چاپ مار کھاتی رہی۔ باپ کہہ رہا تھا۔ ”یار پالتی ہے، جسم بیچتی ہے، حرامی بچے پیدا کرتی ہے“۔ اور پھر ماں بے ہوش ہو کر گری پڑی۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح خوف زدہ کونے میں گندے کپڑوں میں گھس کر بیٹھ رہا۔

لیکن جب وہ اگلی صبح جاگا تو ماں کوٹھری میں نہیں تھی۔ آگ اور

روٹی کچھ بھی نہ تھا۔ وہ سب بھوکے تھے۔ چولہے میں کل دوپہر کی راکھ سب طرف پھیل گئی تھی۔ گندے برتنوں میں کھلے دروازے سے آکر ایک کتا کچھ تلاش کررہا تھا۔ اس کا باپ بھی نہیں تھا۔ شاید وہ ان کی ماں کو ڈھونڈنے گیا تھا۔ وہ سب دروازے کے باہر کھڑے خاموش دور جاتی پگڈنڈیوں کو دیکھتے رہے اور سورج کھیتوں کے کناروں سے گلابی نیلے بادلوں سے اوپر اُٹھتا ان کے سَروں پر آ گیا تھا۔ پھر وہ سب ہولے ہولے چلتے کھیتوں میں گم ہوتی راہوں پر چل پڑے اور چلتے ہی گئے۔ انہیں یک دوسرے کا ہاتھ پکڑنا آتا ہی نہ تھا۔ پیٹ کے اندر اُٹھتے درد کا احساس بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ رہنا چاہا تھا۔ لیکن وہ سب اس سے لاپروا تھے۔ گھر کا کھلا دروازہ دیکھ کر انہیں خوف آرہا تھ۔ اسے بھی روٹی کی تلاش تھی۔ شاید لوگوں نے انہیں روٹی کھلائی تھی۔ یا اس کا باپ واپس آ گیا تھا۔ اس کے باپ نے کہا تھا۔ ’’تمہاری ماں کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اب تم سب بھی بھاگ جاؤ۔ جاؤ اپنی روٹی تلاش کرو۔ میں نہیں کھلا سکتا تم کو‘‘۔ پھر اس کے باپ نے ان سب کو کہیں نا کہیں بانٹ دیا۔ اور چودھری

کی ڈیوٹی تک آ کر اس کی زندگی کی راہ بند ہو گئی۔ اور اس نے کبھی نئی راہ ڈھونڈی بھی تو نہیں تھی، وہ کسی راستے سے واقف بھی نہیں تھا۔ بھینسوں کے لئے چارہ لاتے، چلمیں بھرتے، سافی کرتے اور چودھری کے جسم کی مٹھی چاپی کرتے۔ وہ ہمیشہ اس وقت کا انتظار کرتا جب بے صبری سے روٹی کے بڑے بڑے نوالے وہ اپنے اندر ڈالتا، ایک سرور سا اس کے ذہن اور جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ وہ چودھری کی چارپائی کے پاس زمین پر ہی سو جاتا۔ زمین جواب کشادہ تھی۔ جس پر لیٹ کر اس کا پیٹ بولتا نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ اسے سب کچھ بھولتا جا رہا تھا۔ بھوکا پیٹ، ماں کی سسکیاں، ماتھے سے بہتا خون اور باپ کی گندی باتیں۔ اپنے بہن بھائی بھی جو نہ جانے خزاں کے پتوں کی طرح کون سی انجانی راہوں پر بکھر گئے تھے۔ اس کا رشتہ برہن زمین اور پیٹ میں پڑی روٹی سے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر ہولے ہولے اس کا ذہن بہت سی یادوں سے خالی ہو گیا جس میں اس کا اپنا آپ بھی تھا۔ دنیا صرف چودھری کی روٹی اور اس کے دیے ہوئے حکموں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

بڑا ہونے پر صرف اس کی جگہ ہی تو بدلی تھی۔ اب وہ چودھری کی چارپائی کے پاس ننگی زمین کے بجائے بھینسوں کے باڑے کے پاس ڈیوڑھی میں سوتا تھا اور آتے جاتے لوگوں پر نگاہ رکھتے ہوئے حقہ پیتا رہتا یا کھلے صحن میں لیٹا چاند کو دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھار ٹھنڈا چولہا، گندے برتن اور سرخ خون اس کی یاد میں ابھرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے باپ کا بے چہرہ جسم تو کبھی بھی اس کی سوچ کی پلڑ میں نہیں آتا تھا بس ماں تھی جو اس کے خوابیدہ ذہن پر اُبھرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن پھر ساری یادوں پر بھینسیں اور ان کے گرم سیاہ جسم اور تیز گرم سانسیں چھا جاتیں یا وہ لوگ جو اس کے اِرد گرد پھرتے۔ لیکن ان سب سے وہ بے نیاز تھا۔ اس کی دوستی تو صرف بھینسوں سے تھی جو پکارے جانے پر چونک کر سر اٹھاتیں اور اس کی طرف بھاگی آتیں۔ وہ ان کے درمیان کھڑا مسکراتا پڑتا، ان کے چہروں کے ساتھ چہرہ رگڑتا۔ ان کے جسموں کا لمس اس کے اندر عجیب طمانیت اور آسودگی پیدا کرتا اور پھر باقی کی ساری سوچوں کو بھول کر خوش خوش چلم پر دہکتی آگ میں خواہ مخواہ پھونکیں مارنے لگتا اور راتوں کی لمبائی گھٹ جاتی وہ اپنے اندر اور سکڑ جاتا۔ تب

ساری دنیا گھٹ کر ایک کشش بن جاتی۔ لمبا اور گرم کش۔ یا پھر اسے صابراں یاد رہتی جو اس ساری مخلوق میں اسے نظر آتی تھی۔ جس کے مٹیالے سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں اور ننھا سا کمزور وجود جو گھر کے اندر سے ڈیوڑھی تک سارا دن بھاگتا رہتا۔ اس سے باتیں کرتا ہوا۔

وہ کہتی۔ رحموں۔ بی بی کہتی ہے کھیتوں سے ساگ توڑ لاؤ۔ ماں کہتی ہے کولہے سے تیل نکلوا لاؤ۔ ماں کہتی ہے۔ اور وہ اس کے ننھے سے وجود کو بازوؤں کے جھولے سے زور زور سے جھلاتا سوچتا۔ صابراں بی بی بھی بھینس کے بچھڑے کی طرح ہی اپنی کمزور ٹانگوں پر سارا دن بھاگتی ضرور تھک جاتی ہو گی۔ وہ کہتا ''بی بی آہستہ چلا کرو۔ کمزور ہو رہی ہو''۔ اور وہ کہتی۔ ''رحموں بی بی مجھے اتنا زیادہ مکھن کھلاتی ہے روز۔ تم نے کبھی مکھن کھایا ہے۔ مکھن کھانے سے بچے کمزور نہیں ہوتے۔ تم بھی کھایا کرو۔ میں لا دوں گی''۔

مکھن کے نام پر رحمت علی کو اپنی بھینسیں یاد آ جاتیں اور وہ سارے کام جو اسے کرنے ہوتے۔ وہ کہتا۔ نہیں بی بی جی مجھے مکھن نہیں چاہیے۔

اگلے روز روٹی پر مکھن نہ ہوتا اور وہ روٹی کھاتے صابراں کے وعدہ پورا نہ کرنے پر مسکراتا رہتا۔ اسے صابراں بی بی سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

باتیں جو لڑکیاں کرتیں، جو گھر میں بڑی بی بی کرتیں، وہ ساری باتیں صابراں اسے سُنا دیتی جو اور کوئی نہ سنتا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس بیٹھا رہتا اور اسے لگتا جیسے دنیا بڑی بھری پُری جی رہی ہو۔ جیسے جانور بھی بول رہے ہوں۔ وہ اکیلے بیٹھے ڈیوڑھی کی طرف دیکھتا اور قدموں کی مانوس آہٹ پر خوش ہو جاتا۔ اس کے جی کے سناٹے میں صابراں کے ننھے مُنّے قدم گونجتے رہے۔

راتوں اور دنوں کی لمبائی مل کر بہت سے سال بن گئے۔ بہت سے سال جو بڑی یکسانیت سے اس کے وجود پر سے گزر گئے۔ صرف صابراں بڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ اس کے بازو میں لٹک کر جھولا بھی نہیں جھولتی تھی۔ وہ اکثر رات کو بیٹھا اسے یاد کرتا رہتا۔ اس کے چھوٹے سے وجود کی موجودگی جھولتی تھی۔ وہ اکثر رات کو بیٹھا اسے یاد کرتا رہتا۔ اس کے چھوٹے سے وجود کی موجودگی کو محسوس

کرنے کی شدید طلب اس کو اداس کر دیتی۔ اور پھر اس کو اپنا وجود یاد آ جاتا جو وقت کی دُوری پر ایک کوٹھری کے کونے میں خوف زدہ سمٹا ہوا لیٹا تھا۔

صابراں نے اب اندر سے کاموں کے پیغام لانے چھوڑ دیئے تھے۔ کیوں؟ اسے سمجھ نہ آتی۔ اس کا خوابیدہ سا ذہن اس کیوں کا جواب سوچ نہ پاتا۔ وہ تو اپنے بڑھتے وجود سے بے خبر تھا۔ اسے صابراں کے بڑے ہونے کا شعور کیوں کر ہو سکتا تھا۔

ایک روز اس نے گھر کی ڈیوڑھی پر دستک دی۔ بڑی بی بی نے دروازے پر آ کر پوچھا تھا۔ ''کیوں رحموں کیا کوئی خاص بات ہے؟'' اور اس نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ بڑی بی بی پتا نہیں ڈیوڑھی رات کو سونی سونی کیوں لگتی ہے۔ شاید اس لئے کہ صابراں بی بی اب وہاں نہیں آتی۔ بی بی بس چھوٹی بی بی کی خریت پوچھنے آیا تھا''۔ اور بڑی بی بی زور سے ہنس دی۔ اور رحموں نے سر جھکا لیا۔ ''تُو بھی بدھو ہے۔ جوان لڑکیاں بھلا نوکروں کی ڈیوڑھی میں کیوں جائیں گی۔ لیکن تُو تو اپنا رحموں ہے۔ ارے صابراں دیکھ رحموں آیا ہے''۔ اور بڑی بی بی اندر کو مڑ گئی۔ اور صابراں دروازے میں

کھڑی اسے مسکرا کر شرمائی سی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے تو وہ اب بھی اتنی ہی چھوٹی لگ رہی تھی، اس کے بازو میں جھولتی ہوئی۔ لیکن صابراں آگے بڑھ کر اس کے بازو میں نہیں جھولی تھی۔ اور رحموں کو پہلی بار کچھ کھو دینے کا احساس ہوا۔

''بی بی تم مجھے بہت یاد آتی ہو'' وہ اس کو کہہ رہا تھا۔ صابراں کا چہرہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ جیسے کوئی بہت فکر کی بات اس کے ذہن میں اُتر آئی ہو۔ وہ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی مسکراتی آنکھیں ایک دم بُجھ سی گئیں۔

''ہاں رحموں میرا جی بھی تمہارے پاس آنے کو کرتا ہے۔ لیکن ماں کہتی ہے مجھے رات کی دہلیز سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ جوان لڑکیوں کو بھوت چمٹ جاتے ہیں اور پھر وہ مر جاتی ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتی''۔ وہ اداس ہو رہی تھی۔ رحموں کا جی چاہا کہ وہ بی بی کو پکڑ کر زور زور سے گھمائے۔ لیکن یہ دہلیز۔ اس نے سر جھکا لیا اور لوٹ آیا۔

وہ اس تمام بے بسی کی طرف لوٹ آیا تھا جو اس کے دل میں کون

سے زمانوں سے دفن تھی۔ اسے لگا جیسے ایک بار پھر اس کا اور دنیا کا ناتا ٹوٹ گیا ہو۔ ایک بار پھر وہ اکیلی راہوں پر بے سہارا پھر رہا ہو۔ وہ رات کو بھی اپنی کوٹھری میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے حقہ بھی نہیں سلگایا تھا۔ پہلی بار شعور کے ساتھ اسے اپنا اور دنیا کا ناتا سمجھ آیا تھا۔ وہ وہاں اکیلا بیٹھے بیٹھے رونے لگا۔ اپنی ماں کے لئے۔ اس اذیت کے لئے جو اس کا خالی پیٹ اسے دیتا تھا۔ اور شاید صابراں کے لئے جو پتا نہیں کیسے بڑی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا اور اس کے آنسو اس کی زندگی کے بے خبر ساعتوں میں جذب ہوتے رہے۔

اس نے اپنا سر تب بھی نہیں اٹھایا تھا۔ جب کپاس چننے والی عورتیں تیزی سے کپاس کے پھول چُن رہی تھیں اور صابراں بی بی برگد کے بڑے درخت کے نیچے بڑی بی بی کے ساتھ بیٹھی کپاس کو اپنے ہاتھوں سے بار بار اچھالتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں میں کپاس کے پھولوں کو بھرا اور رحموں پر اچھال دیا۔ رحموں نے سر اور نیچے کر لیا تھا اور اس کا دل مدھم سی روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ صابراں بی بی اس کو بھول نہیں تھی۔ دنوں

بعد وہ ہولے سے مسکرایا۔

''کیوں رحموں تو کیوں نہیں چُنتا کپاس''۔ صابراں نے اسے پوچھا۔ اس نے سَر اُٹھایا۔ سامنے ہی صابراں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پوست کے پھولوں جیسی بہار تھی۔ پھر صابراں نے سر نیچے کرلیا تھا اور اس کے ہاتھ کپاس کے پھول نوچ کر پھینکنے لگے۔ وہ جلدی سے بڑی بی بی کے پیچھے چھپ گئی اور رحموں نے دل میں کہا۔ صابراں بی بی تو سچ مچ بڑی ہوگئی ہے۔ رحموں حیران ہو رہا تھا۔ تو اس کا مطلب ہے بہت سا وقت گزر گیا۔ وقت کیسے گزر گیا۔ وہ سوچوں میں ڈوبا کھیتوں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ چڑیاں ہریاول میں ڈوب اُبھر رہی تھیں اور کھال کا پانی دھیرے دھیرے بہتا ہوا کھیتوں کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا، جیسے صابراں کا خیال اس کے دل میں۔

اور یہ دل جس کی موجودگی کا احساس صابراں کے نام سے وابستہ تھا، رحموں کو پریشان کر رہا تھا۔ وہ کام کرتے کرتے رُک جاتا اور اجنبی نظروں سے اردگرد دیکھتا۔ یہ تو نہیں تھا۔ وہ جو چودھری کی ٹھوکروں میں رہا

تھا۔اس کے اندر ایک اور دنیا جنم لے رہی تھی۔ان چھوٹی اور انوکھی سی۔وہ اپنی سوچوں سے خوف زدہ ہو جاتا۔اگر چودھری کو پتا چل گیا تو۔تو۔وہ جو پہلے ہی کم مایہ تھا، وہ حصوں میں بٹ گیا تھا۔وہ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹ نہیں پا رہا تھا۔بھینسوں کے باڑے میں رات کو لیٹے وہ پوری توجہ سے آہٹوں پر کان لگا دیتا۔آہٹیں جن میں گلی میں چلتے قدموں، بھونکتے کتوں، کھیتوں پر بہتی سرسراہٹ اور جھینگر کی تیز آواز شامل ہو جاتی۔اور پھر اسے لگتا، دو ننھے منے قدموں کی دھمک اس کے اندر بھرتی جا رہی ہو۔یہ قدم بڑے ہوتے جاتے۔اور چھم چھم اس کے دل کی دھرتی پر ناچتے رہتے اور پھر کپاس کے پھول اس کے وجود کو اپنے اندر چھپا لیتے۔وہ اندھیرے میں بیٹھا مسکرانا چاہتا لیکن۔چودھری کے پاؤں کی تیز ٹھوکریں اس کے وجود کے اندر جاگ پڑتیں۔وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے اندر سمٹ گیا تھا۔وہ صابراں کے تصور کے باوجود زیادہ اکیلا ہو گیا تھا۔

لوگ کہتے ”رحموں تُو تو پاگل ہے۔جانوروں کے ساتھ جانور بن گیا ہے۔باہر نکلا کر۔اپنے جیسے بندوں سے ملا کر۔چودھری کی بھینسیں تیرے

بغیر مر نہیں جاتیں۔مل کر بیٹھنے سے بندے کا ہوش قائم رہتا ہے۔رات کو باہر کیوں نہیں آتا؟'' وہ سنتا اور مسکرا دیتا۔ وہ ان کو کیا بتاتا۔ وہ حقے کی نے پکڑے بیٹھا رہتا۔لوگوں کی باتیں سنتا ہوا لیکن وہ کچھ بھی تو سُن نہ رہا تھا۔ بس ایک ہیولا سا اس کا تعاقب کرتا اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتا۔ یا رات کی وہ آوازیں جواس کے جاگتے وجود کا ساتھ دیتیں۔اور اسے لگتا جیسے وہ رات کی وہ آوازیں جواس کے جاگتے وجود کا ساتھ دیتیں۔اور اسے لگتا جیسے وہ رات پر حکمراں ہو۔صابراں سائے کی طرح اسے نظر آتی اور چھپ جاتی وہ اسے دیکھ کر مسکراتی اور پھر دیوار اس کے آگے تن جاتی۔وہ اس دیوار کی طرف بڑھنا چاہتا۔لیکن اس کے پاؤں زمین میں گڑ جاتے۔وہ تو اسی بات پر خوش تھا کہ صابراں اسے دکھائی تو دیتی ہے۔اس کے حواسوں پر ایک سایہ قبضہ کر رہا تھا۔اور وہ سایہ صابراں کا ہی تو تھا۔جس کی ہنسی گھر کے اندر سے تیرتی اس تک پہنچ جاتی۔جیسے وہ ہنسی اس تک ہی پہنچنا چاہتی ہو۔صرف اس کے لئے ہو۔شاید وہ اکیلے رہتے رہتے پاگل ہو رہا تھا۔

ایک رات جب چاند بڑے سے صحن کے اوپر لٹکا ہوا تھا اور

دیواروں کے سائے مٹیالے سے لگ رہے تھے، اس نے صابراں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ چپ چاپ اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ رحموں نے سر جھکایا ہوا تھا۔ وہ صابراں کی طرف دیکھنے سے ڈرتا تھا۔ بھلا کیوں۔ اس نے سوچا شاید یہ اس کا سایہ ہی نہ ہو۔ ''چھوٹی بی بی کیا بڑی بی بی نے کوئی حکم دیا ہے''۔ وہ اپنی آواز سے بھی خوفزدہ ہو رہا تھا۔ وہ ہولے سے ہنسی اور رحموں کو لگا جیسے کھیتوں کی نالیوں میں پانی ترل ترل بہہ رہا ہو۔ جیسے ہوا سوندھی باس سے بھری اس کو اڑائے لئے جا رہی ہو۔ ''نہیں رحمت علی آج بھی میں اپنے آپ آئی ہوں''۔ وہ دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ اور رحموں کو لگا جیسے اس کے اندر سے بوسیدہ وجود نکل کر نئی روح پڑ گئی ہو۔ وہ زیادہ سوچنے سے ڈر رہا تھا۔ ''بی بی اندر جاؤ۔ چودھری جی خفا ہوں گے''۔ اس کی آواں اپنی خوشی اور خوف سے لرز رہی تھی۔ ''تو اتنا بزدل کیوں ہے رحمت علی؟'' وہ آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور مسکرانے لگی۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔ صابراں بی بی بولی ''تو میری طرف کیوں نہیں دیکھتا۔ میں تیری مہمان ہوں۔ تجھ سے ملنے آئی ہوں۔ میرا جی تجھ سے پہلے کی طرح باتیں کرنے کو

چاہتا ہے۔ بیٹھو باتیں کریں گے‘‘۔ لیکن وہ ویسے ہی سر جھکائے کھڑا رہا۔ اور پھر صابراں خود ہی چلی گئی۔ اور اسے لگا جیسے باہر آسمان پر تارے جلتے جلتے بُجھ گئے ہوں اور ساری دنیا سناٹے میں گِھری تھم گئی ہو۔ وہ اس کے اور اپنے فرق کو سمجھتا تھا۔ اس نے ساری عمر اس کھائی کے دوسرے کنارے پر ہی تو گزاری تھی۔ دل کی تو بات ہی دوسری ہے اور سپنے تو اکیلی راتوں کو آتے ہی ہیں‘‘۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔

وہ کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ چاند بہت اوپر آ گیا تھا اور رات کی مانوس آوازیں بھی اسے اپنی اپنی سی نہیں لگ رہی تھیں۔ سب کچھ بدل رہا تھا۔ پھر رات کی مانوس آوازیں صابراں کی آواز میں ڈھل گئیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگتا۔ اب لوگوں سے ملنا جلنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ راہ کی دھول بھی اسے پیاری لگنے لگی تھی۔ یہ تو اس کے دل کی اپنی دنیا تھی جس میں صابراں کی موجودگی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے وجود کے اندر نامعلوم سی طاقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے سب طرف پست اور کپاس کے پھول کِھل اُٹھے ہوں یا پُروا دبے پاؤں اس کے اندر باہر بہہ رہی ہو۔ وہ

محبت کے وجود کا ادراک نہیں رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ پوری معصومیت اور سچائی سے خوش تھا۔

ایک روز صاباراں پھر آئی تھی۔ اس نے کہا تھا ''رحمت علی میں تو ساری رات ایسے خواب دیکھتی ہوں جن میں مَیں تیرے بازوؤں میں لٹکی جھولتی رہتی ہوں۔ کیا تُو بھی خواب دیکھتا ہے؟'' لیکن وہ کیا جواب دیتا بولا ''صاباراں بی بی خواب تو بے کاروں کا کام ہے۔ میں تو دن بھر کام کرتا ہوں''۔ صاباراں ہولے ہولے ہنسنے لگی۔ وہ کوٹھری میں آتی چاندنی کی مدھم میں کھڑی تھی اور رحمت علی ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جو ہنسی کے بوجھ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس لمحے اسے لگا جیسے اس نے یہ چہرہ پہلی بار دیکھا ہو۔ صاباراں نے اس کی حیران آنکھوں میں جھانکا اور چپ ہو گئی اور رحمت علی کو لگا جیسے اس نے صاباراں کو اپنے سامنے ایک لمحے میں بڑی ہوتے دیکھا ہو۔ اسے اپنے اور صاباراں کے وہاں اکٹھے کھڑا ہونے کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ ''رحمت علی تم چپ کیوں کھڑے ہو''۔ صاباراں نے بولنے کی کوشش کی لیکن پھر وہ بھی چُپ ہو گئی۔ چاند کوٹھری کے سامنے کے صحن کی دیوار کے

دوسری طرف کُود گیا تھا اور رات نے سرمئی دھند میں ان دونوں کو لپیٹ لیا۔

رحموں وہاں کھڑا تھا اور صابراں کا نام سرمئی دھند میں ان دونوں کو لپیٹ لیا۔

رحموں وہاں کھڑا تھا اور صابراں کا نام لمحوں کی چاپ کے ساتھ اس کے دل میں دھڑک رہا تھا۔ صابراں بی بی۔ صابراں۔ لفظ کی تکرار اس کے سینے میں اُتر گئی اور وہ ایک دم خوف زدہ ہو گیا۔ ایک نئی آگاہی کا بوجھ لئے پہلے سے مختلف اور بدلا ہوا۔ اپنا آپ اسے عجیب لگ رہا تھا۔

میں اور صابراں بی بی۔ میں اور صابراں۔ اور چودھری۔ اور دنیا۔ اور خوف سے اس نے آنکھیں موند لیں۔ خوف جو زمانوں سے اس کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اس کی بند آنکھوں میں ایک خواب جاگا تھا۔ خواب جس میں اس کے اور صابراں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی سب کچھ مٹا مٹا اور اُلجھا ہوا تھا جیسے سنسان راتوں کی یخ ہوا اس کے بند دروازے سے ٹکرا رہی ہو اور ایک ہنسی کی آواز جو ایک وجود میں ڈھل رہی ہو۔ اس کے اپنے وجود میں وہ چونک اُٹھا۔ یہ کیسا جہان اس کے اندر جاگ

رہا تھا۔ حیرت اس کے اندر اُتر آئی تھی۔ اپنے ہونے کا احساس۔ اور اس ساری سوچ کی ڈور صابراں کے ہاتھ میں تھی۔

پھر اس نے دنیا کو صابراں کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کا نیا وجود صابراں کے وجود میں تحلیل ہوتا گیا۔ وہ تو اب بھی ہمیشہ کی طرح کہیں بھی نہیں تھا اور ہر کہیں تھا۔ اسے لگتا کہ زمین اور آسمان اس کے بیچ میں ہوں۔ اور وہ ان میں پھیل کر چھا گیا ہو۔ وہ جذبوں کو الفاظ دینے کے فن پر قادر نہیں تھا۔ اس لئے خاموش بیٹھا صابران کے ہلتے لبوں کو دیکھتا رہتا۔ اور رات ان کے گرد دبے قدموں چلتی رہتی لیکن وہ ان لمحوں میں تھم جاتے۔ مٹ جاتے۔ وہ کہتا۔ "صابراں جاؤ۔ بڑی بی جاگ جائے گی۔ لیکن صابراں اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ صابراں نے کہا تھا "رحمت علی پتہ نہیں یہ بھید کس نے مجھ پر کھولا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی تلاش میں تھے لیکن دیکھ لو میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا"۔ اور وہ مسکرانے لگتی۔ اور رات کے اندھیے میں بھی رحمت علی کو لگتا جیسے اس کے چہرے کی روشنی نے دنیا کو چکا چوند کر دیا ہو۔ وہ مبہوت ہو کر اسے دیکھتا۔ وہ کہتا، صابراں،

ہولے بات کرو، کوئی سن لے گا"۔ صابراں ایک لمحے کو چُپ ہو کر اس کی طرف دیکھتی اور پھر زور زور سے باتیں کرنے لگتی۔

رحموں نے کہا۔" صابراں تُو جانتی ہے میں تیرے باپ کا کاماں ہوں، نوکر ہوں جوتیوں میں پکنے والا۔ تیرا میرا کیا ساتھ"۔ صابراں نے تیزی سے کہا۔" یہ بات مت کیا کر۔ مت کہا کر۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔ اور پھر ایسے لگتا ہے جیسے تیرے سارے دُکھ میرے بدن پر گزر رہے ہوں۔ رحمت علی میں نے اپنے من کو بہت روکا ہے لیکن روک نہیں پاتی۔ ڈر مجھے بھی لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہاں تی پہنچ ہی جاتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں؟" صابراں کی آواز کی اداسی بڑی گہری اور کٹیلی تھی۔

رحمت علی نے سر جھکا لیا۔ اسے ساری بات کب کی سمجھ میں آ چکی تھی لیکن جواب دینے کی طاقت اس میں نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں چودھری حاکم خاں کا رعب دار چہرہ ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہتا۔ اور ان نظروں کی زد میں اس کا جسم معدوم ہوتا جاتا۔ صرف ٹھوکریں رہ جاتیں اور اس کے ہاتھ چودھری کے پاؤں کے لمس سے بھر جاتے۔ اس کے

اندر تو چودھری ہی چودھری تھا۔ پھر یہ صابراں کیوں کر اس کی سوچوں میں سماتی جا رہی ہے۔ وہ سوچتا۔ ''تُو کچھ تو بول۔ کچھ تو کہہ مجھ سے، میری طرف دیکھ رحمت علی، میں وہ بچی نہیں جو تیرے بازو میں لٹک کر جھولا کرتی تھی۔ میں تو بہت بڑی ہوگئی ہوں۔ بے خبری ہی میں تیری چاہ کا گہرا دریا میرے اندر بہتا رہتا ہے۔ اور میں اس میں ڈوبی رہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تجھ میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے لیکن دل اس فرق کو نہیں مانتا اس لئے میں نہیں مانتی۔ تُو کیوں مانتا ہے پھر اس بات کو''

صابراں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی گہری لہر سی چھا گئی۔ اس کے بازو نڈھال ہو کر اس کے پہلو میں لٹک گئے اور وہ برہنہ فرش پر بیٹھ کر رونے لگی اور یہ ہولے ہولے روتی آواز ایک بین میں ڈھل گئی۔ ایک اور چہرہ اُبھر آیا جو اس کی ماں کا تھا۔ زرد، کمزور، تمام خوبصورتیوں سے خالی۔ اور پھر یہ چہرہ صابراں کے چہرے میں ڈھل گیا۔ وہ جلدی سے پَرے ہٹ گیا۔

''میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ میرے پاس تو اپنا کوٹھا بھی نہیں صابراں۔ اور بھوکے پیٹ انسان میری طرح کا بن جاتا ہے''۔ وہ دُکھ سے

بولا۔ صابراں ہنسی ”رہنے کے لئے درخت کی کھوہ بھی کام دے جاتی ہے جھلّے۔ اور پھر میں اور تو کوئی زیادہ تو نہیں“۔

”سوچ لے اچھی طرح سوچ لے صابراں“۔ وہ بے بسی سے بولا۔

”پھر نہ پچھتانا مجھے کوئی دوش نہ دینا“۔ میں تو مدتوں سے سب کچھ سوچ چکی ہوں۔ میں تو بس تیری راہ دیکھ رہی ہوں، تُو اگر چاہے تو ہم دونوں اسی وقت ایک نئی راہ کو چل پڑیں“۔ صابراں کی آواز میں ایک انوکھا سا جذبہ تھا۔ ایسی پیاس بھی جو رحموں کے جوان پُرکشش جسم نے اس کے اندر جگا رکھی تھی اور رحموں نے اپنی اس کشش سے بے خبر تھا۔ اسے تو اپنے جسم کا صرف اس وقت احساس ہوتا جب چارے کا بڑا سا گٹھا اُٹھائے وہ پگڈنڈیوں میں تیز تیز چلتا میلوں کا فاصلہ پلک جھپکتے طے کر لیتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہتا۔ ایک روز فضلو تیلی کی لڑکی نے اس کی راہ روک کر کہا تھا۔ ”تو جانتا ہے رحموں جب جسم جوان ہو تو کیا کہتا ہے؟“ رحموں کو اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی، بھلا وہ جواب کیا دیتا۔ وہ چپ کھڑا راہ سے اس کے ہٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے تو صابراں کے پاس بیٹھے بھی اپنا آپ کبھی یاد نہیں آیا تھا۔ وہ تو بس

ہلکا پھلکا ہو کر لفظوں کے ساتھ اُڑتا رہتا تھا۔ لیکن وہاں راہ میں کھڑی لڑکی اسے ایک اور سفر پر ڈالنے کا سوچ رہی تھی۔ وہ جانوروں کو کھیتوں سے واپس لا رہا تھا۔ ان کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز سرمئی شام کی خاموش موسیقی میں مل کر کھیتوں کے اُٹھتے اندھیرے کے ساتھ اس کے پاؤں سے لپٹ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا "یہ لڑکی پتا نہیں کون سے جسم کی بات کر رہی ہے۔ جسم تو اسے کبھی کچھ کہتا نہیں لگا۔ اس کا جسم تو گہری نیند سویا ہوا تھا" جاؤ کام کرو میں کچھ نہیں جانتا"۔ اس نے چھیماں کو زور سے پرے دھکیلا اور آگے بڑھ گیا "تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ چودھری کے در کا کتا۔ پتا نہیں تو کس کا تخم ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ آ ملنے سے گرے بوٹ کی طرح۔ میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی ارے مجھے تو دیکھ کر مرد راہ بھول جاتے ہیں۔ اور تو۔ تو مرد کب ہے۔ تو تو چودھری کا غلام ہے"۔ اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی اپنے گھر کو جاتی راہ پر مڑ گئی۔

وہ پھر اس سوال میں اُلجھ گیا تھا۔ جواب کئی مہینوں سے اس کے ذہن میں سے محو ہو گیا تھا۔ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ چودھری کے گھر کا کتا۔ پھر

صابراں اس کے پاس کیوں آتی ہے۔ شاید صابراں کو بھی اس کے جسم کی ہی طلب ہو۔ وہ وہاں جانوروں کے پاؤں کی اُڑتی دھول میں کھڑا ہوا گیا۔ اس نے اپنی جسم کی موجودگی کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے اندر باہر تم ہمیشہ کی طرح تاریکی تھی سوائے اس دل کے جو صابراں کی موجودگی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ اس رات وہ ہمیشہ سے زیادہ اداس ہو گیا تھا۔ "ہاں تو میں کچھ بھی نہیں۔ شاید میں ہی وہ سایہ ہوں۔ جو مجھے ڈراتا رہتا ہے جو میرے اپنے اندر سے نکل کر مجھے شک میں ڈال دیتا ہے"۔

یا آملنے سے گراوٹ۔ اور یہ آملنا۔ یہ کہاں گیا۔ اب تو کوٹھری کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ اور بہن بھائی۔ وہ اپنی کوٹھری کے دروازے پر چپ چاپ بیٹھا دُور تک کھیتوں پر پھیلی سیاہ چادر کو گھورتا رہا۔ اس کے اندر تنہائی اور بے چارگی کا کڑوا دھواں بھر گیا۔ صابراں اور میں۔ اور یہ ساری دنیا۔ اس کا اکیلا وجود۔ اس کا دل چاہا وہ ان محبتوں کے لئے روئے جن کا خیال اس کے ذہن میں کہیں بہت نیچے تھا۔ وہ اُٹھ کر چلنے لگا۔ کھیتوں کی نرماہٹ، زمین کی ٹھنڈک، ہَوا کے جھونکے۔ اس کا رشتہ ان سب سے بھلا کیا بنتا تھا۔

وہ تو بے جڑ پودا تھا۔ اسے اپنے خالی دل سے ڈر آنے لگا۔ وہ بے کنار کھیتوں کے درمیان خاموش کھڑا ہو گیا۔ ہاں میں کون ہوں؟۔ کون ہے میرا؟ اس کی روح کے اندر ایک کنواں سا ہو گیا تھا اور اس کی ہچکیاں کھیتوں پر بہتی ہوا کے ساتھ سرسراہٹ پیدا کرتی اس وسیع خلا میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن کوئی بازو بھی ایسا نہ تھا جو اسے سمیٹ لے۔ اسے وقت کی دھند میں لپٹا یک بازو یاد آیا جو زمانوں کی دوری سے اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اسے صابراں یاد آ رہی تھی۔ محرومیوں کی تیز نوک دور تک اس کے اندر اُتر گئی۔ لیکن صابراں بھی تو اس سے زمانوں کی دوری پر تھی۔ پھر اس ساری چاہت کا کیا فائدہ! اس نے ڈیوڑھی میں سونے کی بجائے کھیتوں پر سونا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ صابراں کی موجودگی سے ہمیشہ خوف میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اور اسے لگتا تھا جیسے چودھری اسے ٹھوکریں مار رہا ہو۔

اور پھر اس کا پیٹ ایک انجانی تکلیف سے بھر جاتا جو روٹی سے بھر نہ بھرتا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھنا چاہتا۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتا۔ لیکن اسے تو باتیں کرنی آتی ہی نہ تھیں۔ اور بھینسیں صرف اس کی طرف بڑھ کر اپنا سر جھکا

دیتی تھیں۔ کچھ بولتی نہیں تھیں۔ وہ بھینسوں کے ساتھ خود بھی بے زبان ہو گیا تھا۔

بس اسے صابراں کی موجودگی میں ہوا زیادہ ہلکی اور ٹھنڈی لگتی اور اس کے ہوتے ہوئے ساری دنیا اس سے بہت دُور ہٹ جاتی۔ ساری سوچیں، ساری محرومیاں اور ایک بے ضَرر سے خوشی میں وہ اپنے گہرے کنویں میں اُتار دیا تھا اور اب اسے لگتا جیسے وہ ڈوب رہا ہو۔ جیسے صابراں ڈوب رہی ہو۔ اور اسے صابراں کا ڈوبنا منظور نہیں تھا۔

پھر انسانی فطرت کی ننھی سی خوشی کو اس نے خود تج دیا۔ وہ ان خوشیوں کا حق دار نہیں تھا۔ وہ تو چلو بھر گدلا پانی تھا جس میں چاند کا سایہ نظر آنے لگا تھا۔ چودھری حاکم خاں نے سبب پوچھا تھا۔ لیکن اس نے سر جھکا لیا اور کہا ”بس جی یہاں اب میرا جی نہیں لگتا۔ اور جانوروں کے لئے بھی جگہ کم پڑتی ہے۔ وہاں کھُلے میں ٹھیک رہیں گے“۔ وہ کیا بتاتا کہ اس کا جی بھی لوگوں کو دیکھ کر گھٹنے لگتا ہے۔ اس نے دُور دروازے سے جھانکتی صابراں کی آنکھوں میں بھری حیرانی کو نہیں دیکھنا چاہا تھا۔ اس نے تو سر ہی نہیں اٹھایا

تھا۔ اسے سر اُٹھانا آتا ہی نہیں تھا۔

اور صابراں کی روح کھنچ کر اس کے ہلتے لبوں کی ہر جنبش میں کانپ رہی تھی۔ اسے کسی دُکھ دینے والی بات کا احساس ہو رہا تھا۔ اور رحمت علی کے دُکھ کے خیال سے ہی وہ دُکھی ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا وہ اس کی راہوں میں پھول بکھیر دے اور اس کے سر پر اپنے پلو کا سایہ کیے ساتھ ساتھ چلتی رہے۔ اس ساری جی کے اندر اترتی گہری چاہت نے اس کے انگ انگ کو نکھرا دیا تھا۔ اس کی ساری ذات ان لمحوں میں قید ہو جاتی تھی جب وہ سائے کی طرح چلتی اس کی کوٹھری کے اندھیرے میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اس کی ذات کی خوشبو اس گوبر کی باس کے اوپر چھا کر اس کے اندر اُتر جاتی تھی۔ وہ اپنی ذات کو اس کی ذات میں گھول دینا چاہتی تھی۔ وہ تو اس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب رحمت علی خود آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامے گا۔ وہ انتظار کرنا چاہتی تھی اس وقت کا جب اس کی جھکی آنکھیں سیدھی اس کی آنکھوں میں اُترنا سیکھیں گی۔ وہ تو رحمت علی کو اس بے چارگی اور بے بسی سے نکال لینا چاہتی تھی جس نے اسے گھیر رکھا تھا۔ اس کے اندر تو رحم، ترس اور محبت کے

رنگ اُتر کر ایک گہرے رنگ میں ڈھل گئے تھے اور یہ رنگ ساری دنیا کو اس کی نظروں سے اوجھل کئے ہوئے تھا۔ اس کی اپنی ذات کو بھی۔ وہ جو چودھری حاکم خاں کی بیٹی تھی، ایک معمولی آدمی کو اپنے دل میں بٹھائے بہت اونچا اُڑ رہی تھی۔ اگر خوف تھا تو بس اتنا کہ رحمت علی کہیں گم نہ ہو جائے، چلا نہ جائے، روٹھ نہ جائے۔ لیکن جب رات کو جانور کھیتوں سے واپس نہ آئے تو اس نے ماں سے پوچھا تھا۔ ''کیوں بی بی یہ جانور کہاں چلے گئے؟ رات ہو گئی ہے۔ پتا کرنا چاہیے''۔ ماں نیکہا۔ ''رحموں کہتا ہے وہ کھیتوں میں ہی سوئے گا۔ یہاں جگہ تنگ پڑتی ہے''۔ اور ماں نے لحاف پر اپنا سر جھکا لیا تھا لیکن وہ ایک لمحہ صابراں کے سارے جسم میں تیز گرم سنسناہٹ بن کر دوڑ گیا۔ اس کا سر بھاری ہو گیا اور اس کے کان تیز آوازوں سے بجنے لگے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہو۔ پھول کاڑھتے ہوئے تیز سوئی اس کے ہاتھ میں اُتر گئی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اچھا!۔ اس نے اپنی پوری طاقت لگا کر کہا اور اُٹھ کر کوٹھری میں چلی گئی۔ وہ اس بات کا سبب جاننا چاہتی تھی اور رحمت علی جو برسوں سے اس کی

سوچوں کا ایک حصہ تھا بغیر اسے بتائے اس کی ذات سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن تیز دہکتا ہوا خوف اس کے وجود میں دوڑ رہا تھا۔ اب کیا ہو گا؟ کیا ہو گا؟۔ کیا ہو گا۔ پھر ہولے ہولے ساری جلن بجھتی آگ کی طرح ٹھنڈی ہو گئی اور اکیلے رہ جانے کا یخ بستہ احساس اس کے اندر سرسرانے لگا۔

وہ اپنے بستر میں چھپی روتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یخ آنسو اس کے چاروں طرف بہہ رہے ہوں اور وہ ان میں ڈوب رہی ہو۔ مر رہی ہو۔ اس کا جی زور زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ کس کو سنائے۔ اس نے کھیتوں میں جانے کے خیال کو زبردستی روکا تھا۔ اس کے بُجھے چہرے کی ساری رونق تو اس چہرے میں تھی جو ڈیوڑھی کے اندر روشن تھا۔ صابراں کو آنے والی کسی سختی کا احساس تک نہ تھا۔ زمانہ، لوگ، باپ، ماں، بہن بھائی۔ صرف رحمت علی تھا جو سارا وقت اس کے دل کے اندر سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ اور چاہت کے گہرے رنگ جو اس کی آنکھوں کے سامنے بکھرے رہتے، وہ تو ان میں سر تا پا بھیگ گئی تھی۔ دنیا تو اسکے اندر تھی باقی سارا جہان تو خالی تھا۔

ہر آہٹ پر وہ چونکا اُٹھتی۔ چادروں پر کاڑھے پھولوں میں اسے

رحمت علی کا چہرہ نظر آتا تھا۔ اور وہ سوئی کو ہاتھ میں تھامے انہیں دیکھتی رہتی۔ اسے ہر چیز بھولتی جا رہی تھی۔ اب اسے رات کی خوبصورتی کا احساس بھی نہ ہوتا۔ اور سیاہ آسمان میں تارے چمکتے، چاند کا بڑا سا چہرہ اس کے کھلے صحن میں جھانتا اور شیشم کے بڑے بڑے پتے سر سر کرتے جھومتے ہوئے اس کے صحن میں گرتے تو وہ سوچوں سے چونکا اُٹھتی۔

صابراں کو بہت سی باتیں اب سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اس کے باپ کا رعب، ماں کی مظلومی، ان کی مربعوں پھیلی ہوئی، زمینیں، اس کا اور رحمت علی کا فرق، گہری کھائی۔ کھائی جو اسے ڈراتی رہتی، جو اس کے اندر بھری دنیا کو نگل لینا چاہتی۔ لیکن صابراں کا وجود صِرف ایک چہرہ دیکھتا رہتا۔ اور ساری دنیا اس کے پیچھے چھپ جاتی وہ یادوں کے پھولوں پر پاؤں دھرتی بہت دُور نکل جاتی۔ رحمت کی کھوج میں۔ رات کو لڑکیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے کسی کے دو ہاتھ اسے ایک انوکھے سے لمحے کی یاد بھی ایک تکلیف وہ کرب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ اس جاگتے وجود کی موجودگی سے ہر ساعت آگاہ رہتی اور اس کی آنکھیں تکلیف دہ گہرے آنسوؤں سے بھر

جاتیں وہ جلدی سے اپنی باری دینے کے لئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔

رحمت علی بھی آتا اور چودھری حاکم خاں سے مل کر چلا جاتا۔ وہ اس ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ دوری نے صابراں کو اس کے دل کے اندر اور بھی گہرا اُتار دیا تھا۔ وہ تصور میں اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ لیکن ڈر کر فوراً آنکھیں کھول دیتا۔ وجود غائب ہو جاتا۔ رحمت علی خوف سے کانپ جاتا جیسے چودھری اس کے اندر کی چوری سے واقف ہو اور اسے ٹھوکریں مارنے لگا ہو۔ واپسی کی ساری راہ وہ مڑنے کے لئے بے چین رہتا لیکن اس کے پاؤں کے نیچے تو کوئی راہ نہ تھی، وہ ساری رات کھیتوں کے کنارے کنارے پھرتا رہتا۔ صابراں اور چاند طلوع ہوتے اور ڈوب جاتے۔ وہ تھک کر کسی منڈیر پر بیٹھ جاتا اور کسی ان ہونی کا انتظار کرنے لگتا۔ اور بہت سے دن بیت گئے۔ ایک رات جب چاند گندم کے کھیتوں پر چمک رہا تھا اور ہوا پکی بالیوں پر جھولا جھول رہی تھی، اس نے صابراں کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ صابراں کا وجود کھیتوں کے اوپر چھائی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ رحمت علی خوف زدہ ہو گیا۔ صابراں بی بی۔ صابراں بی بی!۔ کیا یہ

تم ہو؟۔ کیا یہ تم ہی ہو؟" صابراں کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"رحمت علی میں جانتی ہوں میں صابراں بی بی ہوں۔ لیکن میں ایک وہ بھی تو ہوں جسے عورت کہتے ہیں میں نے اپنے جی کو بڑا روکا۔ لیکن دیکھ لو اس وقت میں یہاں کھڑی ہوں۔ مجھے یہاں آنے کا ملال بھی ہے۔ تم بھی نہ جانے کیا سوچو گے لیکن قسم ہے اس خدا کی جس نے مجھے پیدا کیا، مجھے اپنے قدموں پر زور نہیں۔ میں جانتی ہوں غیرت والیاں ایسا نہیں کرتیں۔ لیکن رحمت علی میرا دل اور میرا وجود تمہیں بُلاتا ہے بتاؤ میں کیا کروں؟" اس کے چہرے پر انتظار کا کرب اور اُمید کی جوت سی تھی۔ رحمت علی کا سارا وجود خوف سے کانپ گیا اور وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ جیسے بولنے کی ساری قوت کسی نے سلب کر لی ہو۔ "رحمت علی میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ صرف ایک سچ کا مقابلہ کرنا آسان ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم اگر میرے گھر میں نہ رہتے تو شاید میں تمہاری طرف دیکھتی بھی نا لیکن تم ہی وہ پہلے مرد ہو جس کو میں نے دیکھا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور تو میرے مقدر کا ہے۔ لوگ مجھ پر تھوکیں گے۔ اور میں جانتی ہوں تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکو

گے لیکن میں اپنی بدقسمتی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ لے کر آئی ہوں۔ رحمت علی ڈر نہ جانا۔ خوف نہ کھانا۔ میں مرنے سے پہلے تمہارے ساتھ مل کر دو دن جینا چاہتی ہوں"۔

رحمت علی حیران کھڑا اس کی آواز سن رہا تھا۔ وہ خوش تھا اور یہ انوکھی خوشی اس کے سارے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی اپنی کم مائیگی کا احساس جاگ اٹھا۔ "صابراں تم نے کہا تھا نا کہ میں لوہے کا آدمی لگتا ہوں۔ تم ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ میرا ساتھ کیسے ہوگا۔ میرے پاس تو سر چھپانے کے لئے کوئی چھت نہیں"۔ وہ خوشی اور خوف کی زیادتی سے رونے لگا۔ "پگلے ساتھ رہنے کے لئے تو درخت کی کھوہ بھی بہت ہے"۔ صابراں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ قدم اٹھانے سے ڈر رہا تھا۔ جیسے اس کا سارا وجود اس کے اٹھتے قدم کے ساتھ ہی ڈھیر ہو کر گر جائے گا۔ "صابراں سوچ لو"۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ لیکن صابراں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور آگے کو بڑھ گئی۔ کہاں، کدھر۔ دونوں ہی نہیں جانتے تھے۔

رحمت علی کا وجود کورے برتن کی طرح جس میں پہلی بار پانی پڑنے پر ساں ساں کی آواز آتی ہے، بول رہا تھا۔ اس کا خشک وجود ٹھنڈی تراوٹ سے نہا گیا جیسے ازلوں کی بھوک پیاس جس نے اس کے اندر ڈیرے ڈال رکھے تھے مٹ گئی ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے پہلی بار پوری طرح آگاہ ہو رہے تھے لیکن پھر بھی گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سوچیں جس میں آنے والا وقت نہیں تھا۔ گزرا وقت نہیں تھا بس ان کے ساتھ چلتے لمحے جاندار اور زندہ تھے۔

وہ چلتے چلتے کھیتوں میں ایک ٹوٹی کوٹھری کی دہلیز پر بیٹھ گئے۔ ٹوٹا چھپر اور بوسیدہ دیواریں جو گزرے وقت کی کہانی کہہ رہے تھے اور اب ایک اور کہانی جنم لینے والی تھی۔

صابراں نے نڈھال ہو کر اپنا سر رحمت علی کے کندھے پر رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔ اسے اپنے اور رحمت علی کے وجود کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اور یہ احساس اس کے ہوش گم گیے دے رہا تھا۔ اس پر جادو کر رہا تھا۔

سورج کی روشنی کے ساتھ خوف کے گہرے سائے ان کو گھیرنے

لگے تھے، انہوں نے چونک کر اپنے ارد گرد دیکھا کہ وہ کہاں تھے۔ زندگی کی سنگینی سے خوابوں کی ہریاول میں انہوں نے ایک رات کا سفر طے کر لیا تھا۔ خوب جو صابراں کے وجود کے گرد تانا بانا بُن کر بیٹھ گئے تھے۔ اور رحمت علی بھی تو ہمیشہ کی طرح صِرف حکم مانتا تھا اسے خواب دیکھنے آتے ہی کب تھے۔ صابراں۔ ہم نے کیا کیا۔ ہم نے اچھا نہیں کیا'' رحمت علی پریشان ہو رہا تھا۔ '' کچھ مت سوچو، نہیں تو ہماری عقل ماری جائے گی۔ چڑیا چڑے بھی تو گھر بناتے ہیں، ہمیں بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا''۔ اس نے دُور تک پھیلی ہریاول کو دیکھتے ہوئے حوصلے سے کہا۔ آج اسے اپنا آپ بڑا اونچا اور الگ الگ سا لگ رہا تھا۔ اس نے رحمت علی کو اور اپنے آپ کو ان سارے عذابوں سے نجات دلا دی تھی اور اسے ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں چھپا لیا تھا۔ اس کی بے بسی کا بدلہ چکا دیا تھا۔

ان دونوں نے اس بوسیدہ کوٹھری تک پہنچ کر اپنا سفر ختم کر دیا تھا۔ انہیں آگے کہاں جانا تھا۔ اب صابراں بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔ وہ تو بے حد خوش تھی کیونکہ اس کے اور رحمت علی کے درمیان کا سفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو

گیا تھا۔ اس کے اندر کے عذاب نے اسے پہلی بار اکیلا چھوڑا تھا۔

اور پھر ایک اور رات آ گئی اور صابراں خاموش بیٹھی آنے والے وقت کے لئے اپنے ذہن کو تیار کر رہی تھی۔ چڑیوں اور کوؤں کے جھنڈ کے جھنڈ آوازیں نکالتے آسمان کی وسعتوں میں پھیلے تیزی سے سفر طے کر رہے تھے۔ اس نے زور سے رحمت علی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ رات ایک اور افق پیدا کرنے والی تھی جو اُن کے جسموں سے پیدا ہوگا۔ صابراں اپنے ہونے کی نفی کر کے رحمت علی کے سامنے جھک جانا چاہتی تھی وہ اپنے آپ کو رحمت علی پر قربان کر دینا چاہتی تھی اور ایک ہی راہ کے علاوہ اور کوئی راہ سُوجھ ہی تھی۔ لیکن اس کے ذہن اور جسم میں ایک اور خواہش بل کھا رہی تھی اور اس کے اپنے وجود کی خواہش۔ اور صابراں اسے سمجھ نہیں رہی تھی اور پھر سورج دور کھیتوں کے کنارے آہستہ آہستہ زمین کے بطن میں اُتر گیا۔ سرمئی اندھیرا ان کے گِرد جال سا بننے لگا۔ ''کتنا اچھا ہو جو رات نہ آئے''۔ صابراں نے سوچنے کی کوشش کی۔ لیکن رات تو پہلے ہی ان کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

رحمت علی نے صابراں کا ہاتھ پکڑ لیا اور صابراں اسے غیر یقینی اور تذبذب

کے بھنور سے نکال لائی۔ پہلے کی طرح۔ رات گزرتی جا رہی تھی اور پھر رات گزر رہی گئی۔ اس ویرانی میں ایک نئی دنیا کو جنم دے کر۔

اس ٹوٹے چھپر کے سامنے چودھری حاکم خاں کھڑا تھا۔ اس کے جوتے گرد آلود تھے اور پگڑی کا شملہ جھکا ہوا تھا۔ وہ دونوں گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر صابراں رحمت علی کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

''تم دونوں نے اچھا نہیں کیا۔ اور رحموں میں نے تو ساری عمر تم پر بھروسہ کیا۔ لیکن''۔ حاکم خاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ رحمت علی کا جی چاہا وہ سامنے کھڑے شخص کے پاؤں پکڑ لے لیکن صابراں نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ''میں اسے یہاں لائی ہوں میاں جی''۔ اس کی آواز ایک لحظہ کے لئے کانپی لیکن اس نے زبردستی اپنے اندر اعتماد کو اُبھارا۔ اس کو خود معلوم نہیں تھا کہ یہ اعتماد اس کے اندر کہاں سے آیا تھا۔

چودھری حاکم خاں نے سر اٹھایا، اسے دیکھا اور پھر وہاں ان کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ''کتنی عجیب بات ہے۔ میں جو بڑا ہوشیار بنتا تھا، اپنوں سے مات کھا گیا۔ میں تم دونوں کو لینے آیا ہوں۔ میں اپنی لٹی عزت کی

بھیک نہیں مانگتا۔ وہ تو لٹ گئی۔ لوگوں نے میرا تماشا بنالیا۔ لیکن تم دونوں اپنا تماشا نا بناؤ۔ گناہ میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ لیکن بندہ اس راہ پر دُور تک نہیں جاسکتا۔ جلدی تھک جاتا ہے"۔ وہ بولتے بولتے چُپ ہو گیا جیسے سب کچھ کہہ چکا ہو۔ صابراں نے حیران ہو کر دیکھا۔ اور پھر وہ خوف زدہ ہونے کے باوجود اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

صابراں نے سفر کا کٹھن لمحہ اکیلے ہی پار کرلیا تھا۔ وہ کسی بھی بات کے لئے تیار تھی۔ اس مین ایک ہی رات میں سب کچھ سہارنے کی طاقت پیدا ہوگئی تھی۔ جیسے اس نے یک نئی دنیا دریافت کرلی ہو، جیسے اس نے رحمت علی کو اپنے اندر چھپالیا ہو۔ وہ اپنے باپ سے کی گئی زیادتی سے آگاہ تھی لیکن اسے اپنا آپ سب سے بڑا اور اہم لگ رہا تھا۔ اس کے گناہ میں اس کی ساری ہستی شامل تھی۔ اس کا عورت پَن شامل تھا۔ اس کی چاہت شامل تھی۔ رحمت علی کے ساتھ نے اسے اندر سے بڑا مضبوط بنا دیا تھا۔ انہیں زمین بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ ان کے قدم زمین کے بجائے ہوا میں پڑ رہے تھے۔ جیسے وہ انوکھے سے، ہلکے سے ہو کر اوپر ہی اوپر اڑ رہے ہوں۔

چودھری حاکم خاں کے وجود سے ہو کر گزر رہے ہوں، ساری خوشبوؤں کے اوپر تیرتی ان کی اپنی خوشبو اور ساری آوازوں کو ڈھانپتی ان کی اپنی آواز۔

ڈیوڑھی سے اندر جانے سے پہلے صابراں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز کے باہر نیلا آسمان تھا۔ تاحد نظر پھیلی ہریاول میں گھلتا شفق کا رنگ۔

صابراں کو لگا جیسے یہ زمین اس کا اپنا وجود ہو۔ اور یہ شفق رحمت علی کی محبت وہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس نے اپنے وجود کے سچ کو بڑی آسانی سے مان لیا تھا اور آنے والے لمحوں کے سچ کو ماننے کی کوشش میں اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھ دیا۔ جیسے اس نے ایک ہی رات میں جی بھر کر جی لیا ہو۔ وہ سزا کے لئے تیار تھی لیکن اکیلی۔ رحمت علی نے تو ہمیشہ کی طرح صرف حکم ہی مانا تھا۔ وہ بیتے لمحوں میں ایک شہزادی کی طرح اسیر سب سے بے پرواہ گھر والوں کے درمیان کھڑی ہوگئی۔

برہنہ زمین پر بیٹھ کر وہ رحمت علی کے بارے میں سوچتی جا رہی تھی۔ اس کا سارا وجود اس کی بے گناہی کی گواہی دینے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ سارے گاؤں کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کر لینا چاہتی تھی۔ وہ

رحموں کے روندے وجود کو اٹھا کر سب کے سامنے بلند کر دینا چاہتی تھی۔

باہر رحموں اکیلا اور خوف زدہ حاکم خاں کی نظروں کے اٹھنے کا منتظر تھا۔ پچھلے دن رات کی ساری واردات ایک دھند کی مانند اسے یاد آ رہی تھی۔ وہ نئی ٹھوکروں اور ضربوں کی شدت کو دبے ہونٹوں سے سہارنے کا حوصلہ پیدا کر رہا تھا۔ لیکن چودھری حاکم خاں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ یہ حاکم خاں وہ تو نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حاکم خاں زندہ ہی نہ ہو۔ اور رات حویلی کی نفاست سے پتی ہوئی دیواروں کے ساتھ ان کے گرد گھیر ڈالنے لگی۔ منتظر رحموں حیران ہو رہا تھا۔ بھلا چودھری مجھ سے بدلہ کیوں نہیں لیتا۔ وہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے اسے لگا جیسے صابراں ایک سایہ ہو جس کو صرف اس نے چند ساعتوں کے لئے دیکھا ہو اور اس دیکھنے ہی میں اس کی ساری زندگی بیت گئی ہو اس کا دل چاہا وہ اندر جا کر صابراں کو چھو کر تو دیکھے۔ اور جب اس نے صابراں کو دیکھا تو وہ نکاح کے بولوں میں بندھ چکے تھے۔ صابراں نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ اس نے سر کو رضامندی کے لئے ہلایا نہیں تھا۔ اس کا تو سارا وجود رضامندی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

صابراں نے بے یقینی کے ساتھ اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کے ہاتھ کی موجودگی کو محسوس کرنا چاہا لیکن حاکم خاں جا چکا تھا۔ اور صابراں کو پہلی بار لگا جیسے اس کی دنیا میں کہیں گہرا شگاف بن گیا ہو۔ اور وہ اپنے آپ سے بچھڑ گئی ہو۔

حویلی کی ویرانی میں کھڑے صابراں کو بڑی اداسی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے باپ کو جاتے دیکھا تھا۔ اور اسے لگا جیسے سوچ کی ساری قوتیں مفلوج ہو گئی ہیں۔ صابراں اور رحمت علی دونوں بیٹھے رہے۔

اور ایک نئی رات ان کے گرد طلوع ہونے والی تھی۔ رات جو وجود کے بیج کو جنم دیتی ہے۔ رات جو انسان کے دلوں کا شکار کرتی ہے۔ صابراں کو پہلی بار رات سے خوف آنے لگا تھا۔

لیکن اس رات نے حاکم خاں کا شکار کر لیا۔ حاکم خان جانتا تھا کہ عزت کے بغیر آدمی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اس کے وجود کے ساتھ کوئی سر نہیں ہوتا جسے وہ اونچا اُٹھا کر چل سکے اور حاکم خاں نے اس بغیر سر والے وجود کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔

اوراب اسی حاکم خاں چودھری کی قبر کے پاس رحموں ہمیشہ سے زیادہ ویران ہوگیا تھا۔ جیسے اتنی بھری پُری دنیا میں کوئی بھی اس کا اپنا نہ ہو۔ صابراں بھی۔ بس مٹی ہی مٹی ہو۔ گرد ہی گرد ہو جو اس کے وجود میں بھر رہی ہو۔

دو پتّر اناراں دے

قطار در قطار جھونپڑیکوں میں ٹمٹماتے ہوئے دِیے بہت اداس لگ
رہے ہیں۔ آسمان پر جھیر جھیر بادل بہت آہستہ آہستہ انجانے دیسوں کو جا
رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے جہاں ناریل کے اونچے درختوں کی قطاریں
دُور تک چلی گئی ہیں، نیچی چھتوں والی جھونپڑیوں کے باسی ستے چہروں،
ویران نظروں اور خالی دلوں کے ساتھ اینٹوں کے چولہوں پر مٹی کے برتن
رکھے گھاس پھونس میں زور زور سے پھونکیں مار کر آگ جلانے کی کوشش کر
رہے ہیں۔ رات گئے تک قہقہوں کی آواز کہیں نہ کہیں سے آتی ہی رہتی

ہے۔ دُور اُونچے مکانوں میں دریچوں سے روشنیاں آگے جھکتیں، سمندر کی کالی سطح پر اپنا عکس ڈالتیں اور لہروں میں آگے بہتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی پہرے داروں کی لاٹھی ٹیکنے کی آواز کانوں میں بڑے واضح سنائی دیتی ہے اور پھر مہیب سی ہاؤ۔ ہُو۔ یہ تمام چیزیں میرے لئے اجنبی نہیں ہیں، لیکن رگھبیر سنگھ اپنی جھونپڑی سے چپکے سے میرے پاس کھسک آتا ہے اور اپنی میلی سی پگڑی کو اپنے کانوں پر کس کر باندھتے ہوئے کہتا ہے۔

"بابا بخشے، کوئی بات کرو۔ میرا من اس خاموشی سے دب سا جاتا ہے"۔ اور پھر وہ کوئی دوہا گاتے ہوئے گھاس کے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی ٹھوڑی کو اپنے گھٹنوں پر رکھے باہر اندھیرے میں گھورنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی بسنتی پگڑی کا رنگ مَیل اور دھونے کی وجہ سے گدلا ہو گیا تھا۔

میں چپ ہوں۔ میں ہزار بار کی دہرائی ہوئی باتیں دہرانے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن میری باتیں رگھبیر سنگھ کو تسلی نہیں دیتیں۔ میں نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا ہے۔ "رگھبیر سنگھ، اب کے تمہاری فصل کیسی ہوئی

ہے؟'' لیکن اس نے میری بات کو نہیں سُنا۔ وہ اپنی بھاری آواز میں گا رہا ہے۔

''دو پتر اناراں دے۔ ساڈے دُکھ سن سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے''۔

اور یہ سمندر شاید ایسے ہی آنسوؤں نے تخلیق کیا ہے۔ سمندر میں بھی نمکینی ہے اور آنسوؤں میں بھی جو دلوں کے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔

رگھبیر سنگھ کا دل جب زیادہ بھاری ہو جاتا ہے، تو وہ عدالت کو، ججوں کو اور پھر بستی کو زور زور سے گندی گندی گالیاں بکنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ زندگی سے اس قدر غیر مطمئن لگتا ہے جیسے ابھی اُٹھ کر خودکشی کر لے گا یا گہرے پانیوں میں چھلانگ لگا دے گا، لیکن وہ ابھ بھی زندگی سے پیار کرتا ہے۔ زندہ رہنا بھی تو ایک خوبصورتی ہے۔

''یہ سالی زندگی بھی تو اس قدر لمبی ہے۔ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔ سوچتا ہوں جتنی دیر جی سکتا ہوں جی لوں۔ کون سا بار بار آنا ہے۔ اگر

یہاں ہیم رنا ہے، تو کیا غم ہے۔ اپنے لئے سب برابر ہے“۔ اور پھر وہ اپنی چھوٹی سی دھوتی کی ڈب سے بیڑی نکال کر سُلگا تا ہے اور لمبا سا کش لے کر پھر گنگنانا شروع کردیتا ہے۔

”دو پتر اناراں دے۔ دو پتر اناراں دے“۔

اس کی آواز رات کی خاموشی کے سینے کو پار کرتی میری جھونپڑی کے باہر پھیلے سمندر کی سیاہ سطح پر تیرتی جارہی ہے۔

”گھبیر، جاؤ سو رہو۔ رات گزر رہی ہے“۔ میں نے حقّے کا آخری کش لے کر اُسے کہا ہے۔

”بابا بخشے، یہ رات بڑی لمبی ہے۔ نہ جانے کب گزرے گی۔ گزر ہی جائے، تو اچھا ہے“۔ پھر وہ اپنی دھوتی کی ڈب کھول کر کسی بچی کھچی بیڑی کا ٹکڑا ڈھونڈے گا اور دھیرے سے اُٹھ کر دبے قدموں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا جائے گا۔

باہر رات کا جادو پھیل رہا ہے۔

جھونپڑیوں کے دِیے صبح کے تاروں کی مانند ایک ایک کر کے بجھتے

جا رہے ہیں رات کا راؤنڈ شروع ہو چکا ہے۔ لمبے قد اور مضبوط جسم والا افسر جس کی گہری کالی مونچھوں کے نیچے چھپے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہنسی سی رہتی ہے۔ ادھیڑ عمر قیدیوں کے پاس سے گزرے گا، تو رحیم کو مذاق کرے گا:

''کیوں بھئی رحیمے، دودھ میں کتنا پانی ڈالتے ہو''۔

رحیم اپنے لمبے اور گندے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دے گا اور کہے گا: ''بادشاہو! کیوں مخولو کیوں کرتے ہو؟ میں بھلا یہاں پانی ملا کر کیا کروں گا۔ اکیلی جان ہوں''۔ اور وہ دوبارہ ہنسنے لگے گا اور پھر یہ افسر سلطان سے اس محبوبہ کے بارے میں مذاق کرے گا جس کے لئے وہ کالے پانی آیا ہوا ہے۔ سلطان کی آنکھیں خوبصورت ترین عورت کی آنکھوں سے بھی زیادہ پرکشش ہیں۔ اس کی لمبی سیاہ پلکوں کے سایے اس کی آنکھوں میں جب جھانکتے ہیں، تو اس طرح لگتا ہے جیسے سیاہ پانیوں کے جزیرے سمندر کی سطح پر ہولے ہولے ہچکولے کھا رہے ہوں۔ اس کے چہرے پر نرمی سی ہے۔ جب اس کی ماں کے لمبے لمبے خط آتے ہیں، تو وہ پہروں اپنی جھونپڑی میں پڑا روتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دوسری صبح اس کی آنکھوں کے

سُوجے ہوئے پپوٹے دکھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے گھر سے آئے ہوئے پپیوں سے سب کو ڈھیروں تاڑی پلاتا ہے۔ اس رات اس کی سجی ہوئی جھونپڑی کے گرد چھوٹے افسروں اور سنتریوں کا ایک مجمع ہوتا ہے۔ جو تاش کھیلتے، سگرٹیں پھونکتے ہوئے سلطان کے کہے ہوئے شعروں کی تعریف کرتے ہیں اور پھر خوش خوش اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور سلطان پھر اکیلا رہ جاتا ہے۔ اپنے دل کی تنہائی کے ساتھ بالکل اکیلا اور پھر وہ اپنی کشتی کو چپوؤں سے کھیلتا سمندر میں دُور تک چلا جاتا ہے۔ اس کے چپوؤں کی آواز لپ جھپ، لپ جھپ رات گئے تک گونجتی رہتی ہے۔ پھر نے جانے وہ کب آ کر سو جاتا ہے۔

سلطان بہت کم میرے پاس آتا ہے۔ وہ اکثر جزیرے کے دوسرے کنارے پر بسے ہوئے لوگوں میں جا کر مچھلی کا شکار کرتا ہے یا درختوں کے جھنڈ میں جا کر غلیل سے ننھے ننھے پرندوں کو نشانہ بناتا ہے۔ زخمی ہو جانے پر انہیں اپنی جھونپڑی میں لے آتا ہے اور پھر تمام ہمدردی اور پیار سے ان کی مرہم پٹی کرتا ہے اور پھر جب وہ تندرست ہو جاتے ہیں، تو ان کو

اپنی ہتھیلی پر بٹھا کر اُڑا دیتا ہے اور پھر جب وہ تندرست ہو جاتے ہیں، تو ان کو اپنی ہتھیلی پر بٹھا کر اُڑا دیتا ہے اور تب اس کی آنکھوں میں ایک خواہش، ایک بے اطمینانی سے جھلکنے لگتی ہے اور وہ نیلے آسمان میں اُڑتے اس پرندے کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ پرندہ دُور کسی جھنڈ میں غائب ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی وہ نہ جانے کسے دیکھتا رہتا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے ایک نرم سی، ایک محبت سی اُمڈ آتی ہے جیسے وہ سلطان نہ ہو، میرا اپنا بیٹا فضل ہو، میرا اپنا کرم داد ہو۔ ہم جو اپنی ہی نفرتوں یا محبتوں کا شکار ہو کر یہاں آتے ہیں انسانی محبت کے بندھن میں نہ جانے کیوں بندھ جاتے ہیں۔ میں جانتا ہوں اس کی روح اس قید سے رہائی پانے کو بے قرار ہے، لیکن اس نے اپنا دُکھ مجھ سے کبھی نہیں کہا۔

ایک رات آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا رہے تھے۔ سمندر کے سیاہ پانی پر لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اندھیرے، جھونپڑیوں کی دیواروں کے ساتھ لگے آگے بڑھ رہے تھے اور ہوا بوجھل قدموں سے ان کی چھتوں پر جھکی جھکی چل رہی تھی۔ پہرے داروں کی سنگینیں بجلی کی چمک میں روشنی کی لہر پیدا

کرتیں اور اندھیرے میں چھپ جائیں۔ تیز تیز وسلوں کی آوازیں گرج میں گم ہو جاتی تھیں۔ میں نے نریندر کو اپنی جھونپڑی میں گھستے دیکھا۔ اس کے چہرے کی جلد خاکستری رنگ میں بدل چکی تھی۔ آنکھوں کے سرخ رنگ میں کچھ کر بیٹھنے کا جذبہ تھا۔ وہ بار بار اپنے اُلجھے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس کے لب ہل رہے تھے۔ شاید وہ اپنا کہا ہوا گیت گنگنا رہا ہو۔

"آؤ بیٹھو بیٹے" میں نے نئے کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ مڑ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور تیز تیز سیٹی بجانے لگا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے سمجھانا چاہا۔ میں کہنا چاہتا تھا۔

"بیٹے، تمہاری روح کا دُکھ میں پہچانتا ہوں، لیکن یہاں ان کالے پانیوں میں گھِرا ہوا انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ پانیوں کی گہرائی دوسری دنیا سے ناطے توڑ دیتی ہے۔ ہمیں تو جنم جنم اچھے دنوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی نہ جانے اچھے دن ہمیں اس پار بُلاتے ہیں یا نہیں" لیکن میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ خود ہی اندر آ کر ایک صندوق پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالہ تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور بھی بڑی لگ

رہی تھیں۔ دُور سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور پھر رگھبیر، گلاب، رحیموں، کالا اور بلونت سنگھ میری جھونپڑی کے اندر آ گئے۔

گلاب دین کہہ رہا تا: "رگھبیر سنگھ، ہم سب برابر ہیں۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا نہیں۔ جنم الگ الگ لینے سے کیا ہوتا ہے، قسمتیں تو ایک جیسی ہین۔ کوئی آگے کوئی پیچھے، بہت سوں کو یہاں آنا پڑا ہے اور بہت سوں کو یہاں آنا پڑے گا۔ وہ بھی یہی دکھ اور تکلیفیں برداشت کریں گے جو پہلے پہل دل کو چھیدئی ہیں، پھاڑتی ہیں، لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ دل کو چھوٹا مت کرو رگھبیرے۔ تم تو ابھی جوان ہو۔ ان سالوں کے بعد بھی زندگی ہو گی"۔

بلونت سنگھ نے سلطان کو دیکھ کر زور کا قہقہہ لگایا: "ارے پلّے، کونے میں کیوں دبکا بیٹھا ہے۔ لے یہ بیڑی پی اور عیش کر۔ سالے خواہ مخواہ دل میلا کئے بیٹھا ہے۔ یار عشق کرنا کیا ضروری تھا۔ اگر ہمت نہیں تھی تو رقیب کو جلنے دیا ہوتا"۔

سلطان ایک دَم کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے کی رگیں غصے سے اُبھر

آئیں اور اس کی خوبصورت آنکھیں نفرت اور غصے سے بھر گئیں، لیکن پھر دوبارہ وہ صندوق پر بیٹھ گیا اور بولا:

''تم اس زندگی کے عادی ہو بلونت سنگھ: لیکن میں اس کا عادی نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔ چاہے آزادی کے ایک لمحے کے لئے مجھے زندگی سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں''۔

گلاب دین ہنس کر بولا: ''دوست، غصے میں مت آؤ۔ کیا عدالت نے تمہیں اس لئے یہاں بھیجا ہے کہ تم آسانی سے اپنی دنیا میں واپس جا سکو۔ اگر ایسا ہوتا تو آئے دن جھونپڑیاں نہ ملتیں، پکی پکی بیرکیں تعمیر نہ ہوتیں، تم ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے نہ پاتے، مگر ہم بھی زمانوں سے درختوں کے پتوں سے جھانکتے چاند اور تیز دھوپ کو برداشت کرتے چلے آئے ہیں۔ دل تمام امیدوں سے خالی ہو چکا ہے۔ اب تو آنے والے آزادی کے دن بھی بے حقیقت نظر آتے ہیں۔ جو بھی ہوگا۔ دیکھا جائے گا''۔

سلطان خاموش وہیں صندوق پر بیٹھا رہا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں جیسے سو رہا ہو۔

رگھبیر نے زور سے ہو ہو کی آواز نکالی۔ وہ ماہیا گا رہا تھا۔ ماہیا جو ایک برہن دل کی پکار ہے۔ کالا پاس پڑی تھالی پر تھاپ دینے لگا۔ اُس کی تھاپ بے سُری تھی، لیکن وہ سب خوش ہونا چاہتے تھے۔

"آ میری گوری اونچے درختوں پر پینگیں ڈالیں اور بادلوں کو چھوتے ہوئے لافانی محبت کے گیت گائیں۔

آ میری گوری تیری بانہوں میں دھنک رنگ چوڑیاں پہناؤں، کیونکہ تیرا رنگ بجلی سے بھی زیادہ گورا ہے۔

اپنے منہ کو بند رکھنا۔ نہیں تو اندر چھپے ہوئے ہیرے چور چرا کر لے جائیں گے"۔

رگھبیر گا رہا تھا۔ پنجاب کا گیت۔ اپنی محروم محبت کا گیت۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی گوری کبھی اس تک نہیں پہنچے گی، کبھی ان پانیوں کی پایاب گہرائیوں کے اوپر کسی گوری کے قدموں کے نشان نہیں پڑیں گے۔

رحیوں نے اپنے پیلے دانتوں سے گھاس کا ایک تنکا چبایا اور کونے میں تھوکتے ہوئے بولا:

"یار سلطان، آ تُو بھی من کی موج کر۔ کونوں کھدروں میں گھُسنا تجھ جیسے جوان کو زیب نہیں دیتا۔ عشق وشق تو سب ڈھکوسلا ہے۔ جب تُو دو سال اور یہاں رہے گا، تو تجھے ایسا محسوس ہوگا جیسے اس سے پہلے تمہاری کوئی زندگی نہیں تھی۔ بس یہ زمین اور دُور بہت دُور کا آسمان ہمیشہ ہمیشہ سے اپنے سروں پر تنا کسی سنتری کی طرح کھڑا نگہبانی کرتا تھا آگے اور پیچھے کچھ نہ تھا اور نہ کچھ ہوگا"۔

سلطان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں زور سے دبائے چھت کو گھُور رہا تھا۔ بلونت نئے کُرتے کی جیب سے سستی شراب کی بوتل نکالی اور سب گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ رحیموں نے زبردستی سلطان کو اُٹھا کر اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ پیچھے کی طرف منہ کر کے اپنی آستینوں سے کبھی کبھی آنسو پونچھ لیتا، مگر اس نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہ چکھا۔

تھوڑی سی شراب ہی ان سب کو بہکا دیتی ہے اور پھر وہ سب ان دنوں کی باتیں کرنے لگتے ہیں جب ان کی زندگی رواں دواں پانی کے دھارے کی طرح دُکھ کے تنکوں کو سمیٹے چپ چاپ آگے بڑھ رہی تھی کہ نہ

جانے کہاں سے راہوں میں پتھر آ گئے اور یہ سب ان سے ٹکرا کر چُور چُور ہو گئے۔

رحیم بخش جس کی ستواں ناک اور بھرے بھرے ہونٹ اور عقابی آنکھیں بہت تیزی سے ادھر اُدھر تاکتی رہتی ہیں، شراب پینے کے بعد بہکتا نہیں۔ بلونت سنگھ کی طرح کبھی اس نے اُٹھ کر پنجاب کا بھنگڑا نہیں ڈالا۔ رگھبیر کی طرح کبھی ماہیئے کے الاپ اس کے ہونٹوں پر نہیں آئے۔ وہ دھرتی کی مانند خاموش اور گھمبیر ہو جاتا ہے۔ بس اس کے لبوں پر ایک سنجیدہ سی ہنسی آجاتی ہے اور وہ دوسروں سے الگ ہو کر بیٹھ جاتا ہے اس نے آہستہ سے کہا تھا۔

''حکومت نے ہم کو کالے پانی بھیج دیا، لیکن ہم اپنی یادوں کو کون سے پانی بھیجیں؟'' اور پھر وہ یہاں سے بہت دُور ایک گاؤں میں بسنے والوں کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کچھ اتنے دھیرج سے کہتا ہے کہ سو دفعہ کی سُنی ہوئی بات ہر دفعہ نیا مزہ دیتی ہے۔ وہ اپنی زمین اور زرخیزی کی

باتیں کرے گا۔ نہروں کے اس جال کی باتیں کرے گا۔ نہروں کے اس جال کی باتیں کرے گا جو اس کی دھرتی کے سینے پر کھنچی ہوئی تھیں۔ فصلوں کے اس سونے کی بات کرے گا جو سورج کی دھوپ میں دہکتی تھیں۔ کیسے وہ اور علاقے کے دوسرے سردار گنّے کی فصلوں کے دنوں میں اونچے اونچے قد آور گنّوں کے درمیان جوا کھیلا کرتے تھے۔ ان کی گھوڑیاں کھیتوں کے کناروں پر بندھی نہنہاتی رہتیں اور وہ اپنی دھوتیوں کی ڈب میں بندھے ہوئے زیور یا روپے داؤ پر لگا دیتے۔ ہارنے پر گھر جا کر بیٹھکوں میں بیٹھے سوچ میں ڈوبتے، شراب پیتے یا کسی مزارعے کو بے دخل کرنے کی سوچتے جو اپنے حصے میں کم فصل پیدا کرتا ہو۔

رگھبیر سنگھ خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور پھر کہنے لگا تھا۔ ''رحیم بخش! جب ہم اپنی میلوں تک پھیلی فصلوں کے جوبن کو دیکھتے، تو ہمارا سیروں خون بڑھ جاتا اور پھر ہمیں احساس ہوتا کہ ہم اس دھرتی کے وارث ہیں، ہم اس کے خالق ہیں اور شاید فصلوں کے جوبن جوش بن کر ہمارے خون میں دوڑتا اور ہماری راہ میں آتا ہوا ہر انسان ہمیں بے حقیقت لگتا اور یہاں سے ہماری

دشمنیوں کی بنیاد پڑتی''۔

''ہاں رگھبیر سنگھ! تم ٹھیک کہتے ہو۔ فصلوں کی ہریالی ہمیں عجیب جوش دیتی تھی۔ لیکن وہ دن نہ جانے کب لوٹ کر آئیں گے۔ رحیم بخش نے آہ بھری۔

''وہ دن تو بیت گئے''۔ بلونت سنگھ نے بوتل میں سے آخری گھونگٹ اپنے منہ میں انڈیلا اور بوتل کو ایک طرف رکھ دیا''۔ وہ دن بیت گئے، مگر اب بھی کبھی کبھی خوابوں میں آ کر سب یاد دلا جاتے ہیں''۔

''بھلا زندگی میں دُکھ دینے والی باتیں بھی کبھی بھولتی ہیں۔ میرے بچو''۔ میں نے اپنے زندگی کے گزرے برسوں کو ایک بوجھ کی طرح اپنے دل پر ڈھیر ہوتے جان کر آہستہ سے کہا۔ انسان خوشی کی گھڑیاں تو بھول ہی جاتا ہے، مگر دُکھ۔ دُکھ تو بُرے دنوں میں اور بھی ستاتے ہیں۔ جوئے میں ہارنے پر صفدر خان کو مارنا اس قدر آسان تھا جیسے بچوں کا کھیل ہو۔ بیٹھک میں بیٹھے وہ متواتر جیتتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی گھر والی کے سب زیور ہار دیئے۔ گھر میں ایک پیسہ بھی نہ بچا اور جب وہ طنزیہ ہنسی ہنس کر کہنے لگا:

"بس بخشے: اتنے سے بَل پر جُوا کھیلنے بیٹھے تھے۔ لاؤ کچھ اور لاؤ۔ جُوئے میں کسی کی ہار جیت کا کیا معلوم۔ شاید اب کے تم ہی جیت جاؤ"۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس کی بات میرے دل کو کاٹتی ہوئی پار ہو گئی تھی اور جب وہ اپنی واسکٹ کی جیبوں میں سب کچھ ٹھونس کر جُوتی پہننے لگا تو دیوار کے ساتھ لٹکتی ایک بوسیدہ سی تلوار ایک لمحے کے بعد اس کے آر پار تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو تک رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے جیسے وہ چیخ مارنے والا ہو۔ دروازے پر میری گھر والی کھڑی تھی۔ زرد اور حیران۔ میں نے اسے اندر لے جا کر بٹھایا اور واپس آ کر صفدر خان کی جیبوں سے ہر چیز نکال لایا۔ اس کے پاس اپنے صرف دس روپے تھے۔ نمبردار نے آ کر کہا تھا رحیم بخش یہ کون ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا تھا نمبردار جی میرے سوائے اور کون ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بعد میری ساری حویلیاں اور زمینیں تک بِک گئیں۔ میں اپنے جوان بیٹوں کو غریب کر کے یہاں چلا آیا اور اب احساس ہوتا ہے میں نے صفدر خان کو نہیں مارا، بلکہ اپنے آپ کو ختم کیا تھا۔ اپنے بیٹوں اور بیوی کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اپنی

خوشیوں کو لوٹا تھا‘‘۔

’’بابا بخشے، پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں‘‘۔ رحیموں اُٹھتے ہوئے بولا۔ ’’پچھتانا مردوں کا کام نہیں۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا‘‘۔

’’ہاں جو ہونا تھا سو ہو گیا‘‘۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی بوڑھی ہڈیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ ہم اپنے کیئے کو مٹا نہیں سکتے میرے بچو‘‘۔ وہ سب کچھ دیر بیٹھے رہے اور ایک ایک کر کے چلے گئے، مگر سلطان دیوار سے ٹیک لگائے اُونگھ رہا تھا۔ حقے کی آگ بُجھ چکی تھی۔ میں نے اُٹھ کر ایک پرانی دھوتی کا کنارا پھاڑا، چلم پر رکھا اور آخری چنگاری کو پھونکیں مارنے لگا۔ باہر ہوا کی سائیں سائیں اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ سلطان ایک دَم اُٹھ کھڑا ہوا اور حیران نظروں سے اپنے اِردگرد دیکھ کر کہنے لگا: ’’میں کہاں ہوں، یہ میرا گھر تو نہیں‘‘۔ میں دُکھی دل کے ساتھ اُٹھا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔ میں نے کہا: ’’سلطان بیٹے ہمت سے کام لو‘‘۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہچکیاں لیتا ہوا مجھ سے الگ ہو گیا اور آہستہ آہستہ جھونپڑی میں چکر لگانے لگا۔ کبھی وہ میرے پاس

رک جاتا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ پھر وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور ہنس کر کہنے لگا۔

"تمہاری اس جھونپڑی میں ایک عجیب طرح کا سکون ملتا ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو بابا جانتے ہو میں کیا کہنے آیا تھا کہ آج رات میں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ کہیں بھی کسی جگہ بھی۔ یہاں لوگ پتھر کوٹتے ہیں، چلچلاتی دھوپ میں کھیت جوتتے ہیں اور پھر تمام دکھوں کو سینے سے لگائے جیتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے من کو نہیں بھاتا۔ میں اس کا عادی ہونا نہیں چاہتا۔ میں اپنے اندر کو مارنا نہیں چاہتا"۔

میں نے کہا: "سلطان بیٹا، اگر بھاگو گے تو پکڑے جاؤ گے اور پھر تم سے تمہاری ساری مراعات چھین لی جائیں گی۔ تھوڑی سی زمین خرید لو اور کاشت کرنا شروع کر دو۔ تمہارے ذہن کے اندر بھرا سارا علم یہاں سوائے دُکھ کے، تمہیں کبھی سکھ نہیں دے گا۔ اپنے ذہن کو بھول جاؤ۔ گھر والے کب تک تمہیں اتنے روپے بھیجتے رہیں گے۔ آزاد دنیا کے باسی تمہارے دُکھوں سے آہستہ آہستہ لاپروا ہو جائیں گے اور تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ کوئی

تمہارا ساتھ نہ دے گا''۔

''میرے گھر والے۔ نہیں وہ ایسا نہیں کریں گے''۔ وہ گھبرا کر بولا۔

''میرے بچے، ماں کی ذات اپنی اولاد کے سارے دُکھ اپنے میں سمیٹ لیتی ہے۔ اور کون جانے وہ تمہارے دُکھ کی ماری کب تک زندہ رہے۔ مائیں، جوان بیٹوں کا دُکھ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتیں''۔

''اسے زندہ رہنا ہو گا بابا۔ اُسے زندہ رہنا چاہیے۔ اُس کی آواز میں ضِد تھی اور خوف بھی۔

''نہیں میرے بچے۔ حقیقت سے فرار ممکن نہیں۔ مجھے دیکھو میں خوش ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا اُس کا بھر رہا ہوں۔ اس سے دل قدرے پُر سکون ہو جاتا ہے۔ انسان کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے''۔

وہ چُپ چاپ کھڑا باہر دیکھتا رہا اور پھر کچھ جواب دیے بغیر چلا گیا۔

باہر آسمانی نیلاہٹ قدرے مدھم تھی اور سمندر پُر سکون انداز سے کناروں سے لگا آگے ہی آگے بہتا جا رہا تھا۔ لوگوں کی ٹولیاں کھیتوں سے

گھروں کی طرف لَوٹ رہی تھیں۔ تھکے اور پژمردہ چہرے۔ ہنستے اور لاپرواہ چہرے۔ چہرے جو کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ میں اور سلطان ریت پر دھیرے دھیرے قدم دھرتے پھر رہے تھے۔ جھونپڑیوں کی قطاریں دُور پیچھے چھُٹ گئی تھیں اور چاند کا پورا چہرہ سمندر پر جھکا اپنا عکس دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا:

"میری بوڑھی ماں اُس وقت سجدے میں جھکی میری زندگی کی دعا مانگ رہی ہوگی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوں گی اور وہ پیلی زرد لگ رہی ہوگی۔ اور میری چھوٹی بہن جو اتنے سالوں سے اتنی بڑی ہو جائے گی اور پھر لوگ اُسے میرے طعنے دیں گے۔ وہ میرے یہاں آتے ہوئے چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ بابا مگر وہ لمحہ شاید میری قسمت میں لکھا تھا اس لئے میں اُس بیتے لمحے کو واپس نہیں بُلا سکتا۔ اگر میں بُلا سکتا، تو اشرف خاکوانی کو زندہ کر دیتا۔ میں سلیمہ کو اتنی شدت سے نہ چاہتا۔ مگر اب تو سب کچھ بیت چکا ہے۔ میرے اور زندگی کے درمیان حدِ نگاہ تک پھیلا سمندر ہے اور انڈیمان کی دھرتی ہے جس پر انسان نہیں لاشیں چلتی ہیں۔ یہ چودہ سال چودہ

صدیاں بن کران کے سروں کو جھکائے دے رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ سلیمہ مجھے کیوں اور کب سے پسند تھی، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اگر میں اُسے ایک دن بھی نہ دیکھتا، تو سارا دن اُداس پھرتا رہتا۔ ہم ایک ہی حویلی کے بڑے بڑے دالانوں میں پھر کر بڑے ہوئے تھے۔ اشرف ہیں اور سلیمہ اور بھی بہت سے لوگ جو میرے اپنے تھے، لیکن سلیمہ سے بڑھ کر کوئی بھی مجھے اچھا نہ لگتا تھا۔ میں اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہو گیا، لیکن سلیمہ بھی مجھے ہی کی طرح اچھی لگتی رہی۔ اشرف میرا دوست تھا۔ میں اور وہ ہمیشہ اکٹھے رہے تھے، لیکن سلیمہ تو میرے دل کا راز تھی۔ ایک روز ہم اپنے باغ میں پھر رہے تھے، تو اشرف کہنے لگا:

''سلیمہ اتنی خوبصورت ہے۔ میرا تو جی چاہتا ہے میں سارا دن اُسے ہی دیکھتا رہوں''۔ میں جاتے جاتے رُک گیا۔ میرے جسم کا سارا خون میرے چہرے پر اکٹھا ہو گیا تھا شاید کیونکہ میرا منہ بھٹی میں پڑے لوہے کی مانند دہک رہا تھا۔ میں وہاں پڑے ہوئے لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

''کیوں کیا بات ہے سلطان؟'' اشرف میرے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ شاید میرا جی ٹھیک نہیں۔ صبح سے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی"۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے کھڑا ہو گیا اور بولا: "ہاں تمہارا جسم گرم ہے۔ چلو گھر واپس چلیں"۔ میں بھاری دل سے اُٹھا اور پھر واپس چلا آیا۔ میرے گھر کے دروازے پر کھڑا وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن میں اندر چلا آیا۔ اس رات چھٹی کا چاند مکانوں کے پچھواڑے ابھی نیچا ہی تھا۔ ہماری حویلیوں میں خاموشی تھی، لیکن میں بے چین اور مضطرب تھا۔ میں اشرف سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں سلیمہ سے اپنی زمانوں کی چھپی محبت کی داستان بیان کر دینا چاہتا تھا۔ ایسی محبت جو میری رگ رگ میں خون کی طرح گردش کرتی تھی۔ میں زندگی میں پہلی بار اپنی حویلی سے نکل کر سلیمہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھے آج رات ہی اور ابھی اُسے سب کچھ کہہ دینا چاہیے۔ میں نے سوچا تھا۔ سلیمہ کی حویلی کے باہر درختوں کے جھنڈ تھے، جن کے نیچے بچپن میں مَیں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھپا کرتا تھا۔ رات اکیلی اور ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی۔ سلیمہ اور اشرف دونوں اُس جھنڈ میں کھڑے تھے۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے میں واپس گھر آ

رہا تھا اور اپنے ابا جی کے شکاری تھیلے سے لمبا سا شکاری چاقو نکالا اور اس کی دھار کو انگلیوں پر محسوس کیا اور تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔ سلیمہ جا چکی تھی، لیکن اشرف درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ شاید وہ اس جگہ اب بھی سلیمہ کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ میں چپکے سے آگے بڑھا اور چاقو کو تیزی سے اُس کے سینے میں پیوست کر دیا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور دوسرے لمحے میرے بچپن کا دوست سبز گھاس پر، جو رات کی سیاہی میں سیاہ لگ رہی تھی گر پڑا۔ میں نے چاقو وہیں چھوڑا اور بھاگتا ہُوا دیوار کو پار کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرا چہرہ پسینے سے تَر تھا۔ گھر میں سب سوئے ہوئے تھے اور ساتھ ہی میری قسمت بھی سو گئی''۔ وہ مضمحل سی ہنسی ہنسا۔

''دوسری صبح چاقو اور اشرف دونوں جھنڈ میں پڑے ملے تھے۔ قصبے کی لڑکیاں، عورتیں اس کی جوان موت پر ماتم کر رہی تھیں۔ سلیمہ کے چہرے پر سرسوں جیسے پھولوں کی زردی تھی۔ وہ میری بہن کو یہ خبر سُنانے آئی تھی۔ میں نے دروازے کی درزوں سے اُسے جی بھر کر دیکھا۔ ابا جی حیران تھے کہ میں باہر کیوں نہیں جا رہا۔ میں اپنے بھائی اور دوست کی موت پر کیوں

آنسو نہیں بہا رہا۔ لوگ چاقو اور لاش دونوں، پولیس کے حوالے کر چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میرے ابا جی اندر آئے اور اپنے شکاری تھیلے کو ٹٹولنے لگے۔ وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔

''تین سالہ مقدمہ لڑتے رہنے کے باوجود میری بے گناہی ثابت نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیسے؟ میں گنہگار تھا۔ سلیمہ اور اشرف دونوں کا۔ دونوں کو میں نے کھو دیا اور پھر میں یہاں چلا آیا تا کہ اپنے کیئے پر افسوس کروں''۔ وہ خاموش ہو گیا اور انگلی سے ریت پر لکیریں کھینچنے لگا۔ میں اُسے کیا کہتا۔

دُور سے مشرق کی سرخیاں درختوں کی چوٹیوں پر پھیل رہی تھیں۔ جھونپڑیوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اپنی کشتی کا رسہ کھولا اور سلطان کو وہیں چھوڑ کر جال ڈالنے سمندر میں چلا گیا۔ سلطان ریت پر لیٹا بازو پر سَر رکھے سو رہا تھا۔ کیا خبر وہ یہاں کی زندگی کا عادی بھی بن سکتا ہے یا نہیں۔ یہ سب سوچتا ہُوا میں سمندر میں بہت آگے تک بڑھ آیا۔ ہم سب تو رام چندر تھے جو ان گہرے پانیوں میں گھِرے ہوئے جزیروں میں اپنے بن باس کے دن پورے کر رہے تھے۔ ہم سب جانتے تھے کہ سمندر میں دو میل بھی

آگے تک جانا اپنی موت کو بُلانا ہے۔ زندگی یہاں بھی اتنی بُری نہیں، مگر یہ سوچ کر کہ زندگی کے قیمتی سال ہم یہاں ہی گزار دیں گے، ہماری رگوں میں خون جمنے لگتا ہے۔ بلونت سنگھ اپنے بیلوں کے ساتھ ہل جوتتا ہے اور زمین کی زرخیزی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ وہ فصل پکنے کے دنوں میں کھیت کے کنارے لاٹھی کو گردن پر رکھے پنجاب کی کناریوں کے مِلن کے گیت گاتا ہے۔ رگھبیر سنگھ اور رحیم بخش سمندر کے کنارے پتھروں پر بیٹھے بگوئیں کرتے اور کنکروں کو سمندر میں پھینکتے رہتے ہیں۔ ایک نیا قیدی اور سلطان سمندر کنارے ریت پر لیٹے نہ جانے کیا کیا قصے کہتے رہتے ہیں اور میں کشتی چلاتا ان سب کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔

آج ہمارے جزیرے میں اُونچی عمارتوں، افسروں کے بنگلوں اور کہیں کہیں جھونپڑیوں میں بھی دیئے جگمگا رہے ہیں جن کی روشنی سمندر کی سطح پر ہمیشہ کی طرح ڈولتی اور تیرتی شاید دوسرے کناروں تک چلی جا رہی ہے۔ سنتری جو ہماری ہی طرح قیدی ہیں، بھاری دلوں کے ساتھ بانٹی ہوئی مٹھائی کھا رہے ہیں۔ جھونپڑیوں میں بسنے والے ہندو، سکھ اور دوسرے

مذہب کے قیدی زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی آزادی پر اپنے خیالات سب تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رام نرائن اپنی جھونپڑی میں رگھبیر اور بلونت سنگھ کے ساتھ بیٹھا پنجاب کی آزادی کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔ ستارے اندھیرے کی پلکوں پر آنسوؤں کی طرح اٹکے ہوئے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان ہوا میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔ کچھ دُور تنوا گھنگھرو باندھے، کولہوں پر ہاتھ رکھے ہاؤ ہاؤ کی تال پر ناچ رہا ہے، رگھبیر، ماہیا گا رہا ہے اور کالا ہمیشہ کی طرح مٹی کے گھڑے پر بے سُری تھاپ بجا رہا ہے۔ بلونت سنگھ دو گھونٹ شراب پی کر بڑے جوش سے تالی بجا رہا ہے۔ ہاں آج آزادی کی نئی صبح ہو گی اور ہم اس نئی صبح کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے اداس ہیں، کیونکہ ہم میں سلطان خا کوانی نہیں ہے۔ میری جھونپڑی میں پڑے صندوق پر اس کے جسم کا بوجھ تھا۔ سمندر کے کناروں کی ریت پر اس کے قدموں کے نشان تھے۔ انڈیمان کی بے رحم دھرتی کی سخت فضا میں اس کے غمگین قہقہے تھے۔ پر وہ اب ہم میں نہیں ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے دُکھوں کے باوجود خوش ہیں۔ آج آزادی کی صبح ہو گی

اور سُنا ہے ہم سب جو دکھوں کے ناطے ایک تھے، بٹ جائیں گے۔ ہم جو چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں خوش ہونا سیکھ رہے تھے، ایک دوسرے کو پہچان نہ پائیں گے۔ لیکن سلطان تو ہم سب سے پہلے نئے سویروں کی تلاش میں ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

آج سے دو دن پہلے سمندر میں ہلکا ہلکا طوفان تھا۔ ہوائیں شور کرتی گزر رہی تھیں۔ سلطان میرے پاس آیا اور بولا:

"بابا بخشے! ذرا اپنی کشتی سمندر میں لے جانے کی اجازت دے دو۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود سنتری سے اجازت لے لی ہے"۔ پھر ہنس کر بولا: "یہاں سے نکلنا تو قیامت تک نہیں ہوگا۔ اتنے میلوں کا سفر بھلا میں لکڑی کے تختے پر کس طرح کر سکتا ہوں؟ بس دل کو یہاں پر رہنا سکھا رہا ہوں"۔ اور پھر وہ سمندر کی سطح پر کشتی چلاتا چلا گیا۔ کچھ دُور سے اُس کی سیٹی بجانے کی آواز آتی رہی اور پھر شاید وہ اور دُور نکل گیا تھا۔ جزیرے کی ٹمٹماتی روشنیاں سمندر کے پانی میں گھل مل گئی تھیں اور پھر وہ خوبصورت آنکھوں والا لڑکا آگے بڑھتا رہا اور شاید بھنور سے اپنی کشتی کو نہ نکال سکا۔ سنتری نے

مدد کے لئے سیٹی بجائی۔ دوسرے سنتری اس جگہ جمع ہو گئے۔ افسر اس کو گالیاں نکال رہے تھے۔ گندی اور عریاں گالیاں۔ ایک ماہی گیر آگے بڑھا اور پھر سلطان ایک مچھلی کی مانند جال میں پھنسا باہر نکلا۔ اس کے بال اس کے ماتھے پر چپک گئے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک ہنسی تھی۔ جیسے اُس نے ہم سب کو دھوکا دیا ہو اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ پگلا لڑکا جو مرتے وقت بھی شاید سلیمہ کو یاد کر رہا ہو گا۔ اس سلیمہ کو جس سے اس نے اپنی محبت کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ سلطان چپکے سے ہم سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کے گیٹ بچھڑ گئے۔

آج رات دیے روشن ہیں۔ شاید بٹے ہوئے ہندوستان کے دونوں حصوں میں لوگوں نے چراغاں کیا ہو گا اور سلطان کی ماں نئی اُمید کے ساتھ اس کی زندگی کی درازی کی دعا مانگ رہی ہو گی اور جب اس کو سلطان کو موت کی اطلاع دی جائے گی، تو وہ حیران ہو کر سوچے گی کہ دل سے نکلی ہوئی دعائیں بھی بعض اوقات قبول نہیں ہوئیں۔ رگھبیر نے اُسے دیکھ کر کہا تھا یار سلطان تم ہم سے بہادر نکلے۔ ہم تو اتنے برس، درختوں کے نیچے بیٹھے

آنے والے رُت کا انتظار کرتے رہے۔ روح اور جسم کے دُکھوں کو برداشت کرتے رہے پرتم نے کسی بات کا انتظار نہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کے سرد ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ بلونت نے کہا تھا، مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلتے، رہائی کی جنگ میں میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا، تو شاید بُزدل نہ رہتا۔ رحیم بخش اور کالا روتے ہوئے اپنی پھٹی پگڑیوں کے کناروں سے آنسو پونچھتے رہے اور نیا قیدی پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھتا اس کی پائنتی کھڑا رہا۔

لیکن آج دونوں بعد اُسے سب بھول چکے ہیں۔ نیا قیدی ہمیشہ کی طرح سمندر کنارے لیٹا ریت پر لکیریں کھینچ رہا ہے۔ شاید وہ کسی جوتشی کی طرح ان میں اپنی قسمت دیکھ رہا ہے۔ ایک بوڑھا لٹکی ہوئی بھنووں والا قیدی اول فول بک رہا ہے۔ سلطان کی جھونپڑی کی چیزیں افسر کے بنگلے میں بھیج دی گئی ہیں۔ اور جھونپڑی کا دروازہ چوپٹ کھُلا ہے۔ پانی میں روشنیاں گھُلتی جا رہی ہیں اور میں اپنی جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا سوچ رہا ہوں، لیکن میری تمام سوچیں آگے نہیں بڑھ رہیں۔ شاید میں ٹھہر گیا ہوں۔ یا وقت ٹھہر

گیا ہے۔ میں کس سے پوچھوں۔ دُور سے رگھبیر کی آواز آ رہی ہے:

”دو پتر اناراں دے

ساڈا دُکھ سن سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے“۔

اور دُکھ کے پتھر مجھے پیتے جا رہے ہیں

سمندر کا سیاہ پانی بہتا ہی جا رہا ہے۔ بہتا ہی جا رہا ہے

گاؤں کی بیٹی

راجباہ کے کنارے سرکنڈوں کے پاس بیٹھ کر بھاگاں نے اپنے تپتے ہوئے پاؤں کو پانی میں ڈال دیا اور چلو سے پانی پینے لگی۔ حد نظر تک سٹیالا آسمان کھیتوں پر جھکا لگتا تھا۔ سورج دہکتے گولے کی مانند ابھی تک سر کے اوپر چمک رہا تھا اور گرد آلود راہ کا کوئی سرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھیر دار گھگھرے کو زور سے جھاڑا دوپٹے کو سر پر جمایا اور دُور آتے غلام محمد کو دیکھا۔

''ایسا لگتا ہے سورج آج کبھی نہ ڈھلے گا''۔ غلام محمد نے کندھے پر پڑے تولیہ سے منہ پونچھتے ہوئے بھاگاں کے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھا جو پوست کے پھول کی طرح لال ہو رہا تھا۔

''سورج تو چمکتا ہی رہے گا۔ لوگ چلنا تو نہیں چھوڑ دیں گے''۔ بھاگاں نے بڑے فلسفیانہ انداز سے گیلے ہاتھوں کو اپنے دہکتے ہوئے گالوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

''راستہ آج کچھ زیادہ ہی لمبا ہوتا لگتا ہے۔ گاؤں ابھی بھی چار کوس تو ہوگا ہی''۔ غلام محمد نے اپنی نئی جوتی پر جمی ہوئی گرد کی تہہ کو نفرت سے دیکھا اور پھر بھاگاں کے سڈول جسم پر ایک نگاہ ڈالی جو دوپہر کی گرمی میں بھی کسی ستون کی طرح سیدھا اور مضبوط تھا۔

سرکنڈوں میں بیٹھی ہوئی ننھی چڑیا ہانپ رہی تھی اور کھیت اجڑی ہوئی کوکھ کی طرح ویران تھے۔ گندم کی کٹائی کے بعد کھیتوں میں ابھی تک ہل نہیں چلا تھا۔ سب طرف ایک سنہرا غبار سا ل چھایا لگتا تھا۔

''چودھری ہمیں آج نہیں تو کل تک تو جواب دے ہی دے گا۔ ہم

کل ہی چل پڑیں تو رات پڑے گھر ہوں گے۔" بھاگاں نے جوئی کو پاؤں میں ڈالا اور اپنے گھگھرے پر لگی ہوئی مٹی کو جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اللہ سے بہتری کی امید ہی ہے، خدا اچھی کرے گا۔"

غلام محمد نے تولیے کا ایک کونا پانی میں بھگو کر منہ پر پھیرتے ہوئے دور تک نگاہ ڈالی تھی۔

کھیتوں سے دور بہت پرے کسی گاؤں کے مکان نظر آ رہے تھے۔ چند درختوں کے درمیان گھرا گاؤں کسی تصویر میں بنائی گئی چند لائنیں لگ رہا تھا جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ گھنے درخت کے نیچے بیل، بھینسیں اور گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ سب چیزیں کسی جادو نگری میں بنی بے جان لگ رہی تھیں۔

"بھاگاں یاد ہے ہماری شادی بھی آج کل کے موسم میں ہوئی تھی۔ کتنی گرمی تھی ایسا لگتا تھا جیسے آسمان گرم چلم کی طرح زمین پر الٹا ہو کر اسے جلا رہا ہو لیکن دل کے اندر کتنی ٹھنڈ تھی۔ جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہو۔ میں کتنا خوش تھا۔ تمہیں یاد تو ہو گا۔" غلام محمد نے دور ماضی کے سنہرے

پانیوں میں غوطہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

اور بھاگاں کا دل چاہتا تھا کہ کہے۔" غلام محمد وہ بھی کوئی بھولنے کے دن ہوتے ہیں۔ وہ دن تو آج بھی ویسے ہی محفوظ ہیں، جیسے میرے صندوق میں پڑا میری مینڈھیوں میں گندھا میرا اکیلا کرن کا پھول۔

ایسا تو ہوتا ہی رہا تھا کہ رات پڑے جب گاؤں کے سارے دیئے بجھ جاتے اور دُور سے آتی ڈھولک کی تھاپ گھروں کے اوپر چھائے اندھیروں میں سے تیرتی اڑتی، پر پھیلاتی کانوں میں آتی تو اس ڈھولک کیہ تھاپ بھی ہمارے دل میں جاگ جاتی ہے، جو صرف ہمارے نصیبوں میں لکھی تھی۔ بابل کے وہ بول بھی دل کے اندر صدائے بازگشت کی طرح اُبھرنے لگتے ہیں، جو وقت کے بوجھ تلے دبے لگتے تھے اور ہم آنکھیں بند کر کے اس دولی میں بیٹھ جاتے جو انجانے مردوں کے کاندھوں پر دھری پیا کے دیس جا رہی ہوئی۔

پر بھاگاں نے یہ سب کچھ غلام محمد سے کبھیہ نہ کہا تھا اور اس روز بھی اس نے ہاتھوں کی اوٹ کیے آنکھیں راہ کی دھول پر جما دی تھیں۔ اس کے

گلابیہ ہونٹ شہد بھری مسکراہٹ سے پھیل گئے تھے اور غلام محمد کو سالوں پہلے کا وہ ملگجا اندھیرا یاد آ گیا تھا۔

غلام محمد کا اکثر دل چاہتا تھا کہ وہ بھاگاں کے ساتھ بیٹھا اس زمانے کی باتیں کرے، جب اس کے دل کے اندر اس کا جوشیلا خون سماتا نہیں تھا اور آنے والے دنوں کے خوبصورت خواب دیکھتے دیکھتے وہ ساری ساری رات کھیتوں میں ہل چلاتا رہتا تھا۔ ماہیا کے بول گاتے گاتے اس کا گلا تھک جاتا لیکن اس کی روح ہر وقت ایک سرشاری میں مدہوش رہتی تھی۔ اس مدہوشی کی کیفیت تو اب بھی کبھی کبھی اس کو پیچھے دھکیل دیتی تھی، لیکن اس نے یہ ساری باتیں بھاگاں کو بتانے کا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

راجباہ کا مٹیالا پانی ٹھنڈا تھا اور سرکنڈوں کے نیچے چھاؤں کتنی اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ ''گاؤں چار کوس تو ہے ہی، جلدی پہنچ جائیں گے۔''

بھاگاں نے پاؤں میں جوتی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ ''چار کوس کوئی فاصلہ ہے، اتنا تھوڑا سا۔'' بھاگاں نے چلو سے پانی لے کر منہ پر چھینٹا مارا اور غلام محمد کے آگے آگے چل پڑی۔

"بھاگاں، بھلا مہمند خان کی گھر والی نے کتنے سن اناج صاف کروایا ہے۔" غلام محمد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگاں سے کوئی تو بات کرے جو تیز تیز قدموں سے آگے آگے بھاگی جا رہی تھی، جیسے آج مکلاوے آئی ہو۔ غلام محمد دل میں یہ سوچ کر مسکرا دیا تھا۔

"مہینوں سے تو کامیاں لگی رہی ہیں، مجھے بھلا حساب کیسے آئے گا۔" بھاگاں نے کچھ بُرا مناتے ہوئے جواب دیا۔

"آخر کچھ تو حساب ہو گا ہی"۔ غلام محمد نے بھاگاں کی بے رخی کو محسوس کرتے ہوئے ذرا زور سے کہا۔

"اناج والی ساری کوٹھڑیاں بوریوں سے بھری پڑی ہیں۔ جتنا چاہے کوئی کھائے، کم تو کسی صورت نہیں ہو گا۔ اور دلاور خان اگر یہ رشتہ منظور نہ کرے تو اس کی بیٹی کی بدنصیبی ہے۔"

"نا بھاگاں ایسا نہ کہو۔ خدا دشمن کی بیٹی کو بھی بدنصیب نہ بنائے۔ اپنی تینوں بیٹیوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو دل منہ کو آتا ہے۔ اور پھر تم ہی سوچو دلاور خاں نے خود ہی تو اس بارے میں تم سے بات کی تھی، مرد بچہ

ہے بات سے مڑے گا نہیں۔" غلام محمد کی آواز میں سوچ کی گہرائی تھی اور فکر مندی بھی۔ ان تینوں بیٹیوں کے بارے میں جو اس کے آنگن میں اپنی چھوٹی چھوٹی چُڑیوں کو سر پر جمائے کھیلتی رہتی ہیں۔" راہ کی دھول تنور کی بھوبھل کی طرح گرم ہے۔"

غلام محمد نے بیٹے کی کمی کو دل میں شدت سے محسوس کرتے ہوئے پاؤں پر مٹی کو دیکھ کر محسوس کیا تھا۔

"رب کے گھر کی آس رکھنی چاہیے۔" اس نے بھاگاں کو دیکھ کر دل میں سوچا۔ "رب بڑا بے نیاز ہے۔ رب بڑا دیالو ہے۔"

اونچی دیواروں کے سائے ہاتھ دو ہاتھ لمبے تھے اور دیواروں کے ساتھ لگے چندھیائی آنکھوں کے ساتھ آسمان کو تک رہے تھے۔ خارش زدہ کتے نے دیوار کے تلے بنائے ہوئے گڑھے میں سر اوپر اُٹھایا، ایک آنکھ کھولی اور بھاگاں اور غلام محمد کو جاتے دیکھ کر بھونکنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ لُو کا تیز جھونکا آیا۔ اس نے منہ بند کر لیا اور چند سیکنڈ کے لئے آنکھ کھولے ان کو دیکھتا رہا اور پھر سر کو ٹھنڈی زمین میں گھسیڑ دیا۔

جب بھاگاں اور غلام محمد نے دلاور خاں کی حویلی میں قدم رکھا، تو سورج کا دہکتا ماتھا ابھی تھوڑا سا ایک طرف جھکا تھا۔ حویلی کے بڑے دروازے پر کھڑی ہو کر بھاگاں نے پیچھے نظر کی۔ دور تک کھیتوں کی سنہری مٹی پھیلی تھی... اور کہیں کہیں کھیتوں کی ہریالی جھانک رہی تھی۔ نیم کی ٹھنڈی چھاؤں تلے جھولا پڑا تھا اور بڑے سے صحن کے دوسرے کنارے پر بنے ہوئے جانوروں کے تھان پر سے مٹی گرمی اور گوبر کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

چھتنار نیم کے تلے پانی کے چھڑکاؤ کے بعد دھرتی کی سوندھی باس اٹھ رہی تھی سورج کا تھال کھیتوں کے پرے فصل کی اوٹ میں چھپ رہا تھا اور آسمان پر لالی کا رنگ تھا، جیسے میلے جاتی نار نے ڈھیروں رنگ منہ پر مل لیا ہو۔ حقے کی نے سب طرف گھوم رہی تھی، سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر فکر کے سائے تھے اندر بھاگاں بے چین ہو کر پہلو بدل رہی تھی۔

دلاور خاں نے افق پر اڑتے کوؤں کی تیز آواز کو سُن کر کہا تھا۔

"غلام محمد میں مجبور ہوں، میرا بابا اس رشتے پر راضی نہیں۔ میں تو

ہاں کر چکا تھا اور اب بھی مجھے انکار نہیں۔ پر کیا کروں، بڑوں کا کہا کیسے ٹالوں۔"

رشید خاں جو رشتے میں دلاور کا ماموں لگتا تھا۔ حقے کے تیز تیز کش لینے لگا اور اس کی بوڑھی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ اس کی جھریوں کے جال میں زمانے کے ان گنت تجربے پنہاں تھے۔ وہ خاموش تھا، جیسے اس کو یہ انکار پسند نہ ہو۔

"دلاور خاں! بات کہتے سوچ لیا ہوتا، تو بہتر تھا۔ مہمند خاں کوئی ایسا ویسا آدمی تو نہیں۔ ہزاروں مربعوں کا مالک ہے۔ درجن آدھ درجن جانور دودھ کے لیے اس کے تھان پر بندھے رہتے ہیں۔ ہزاروں کا لین دین کر سکتا ہے"۔ رشید خاں نے نے کو دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔

"پر ماموں، بابا کی بات... میں کیا کروں... مجبور ہوں..."

"چودھری جی میری عزت کا سوال ہے۔ مہمند خاں کے ہاں میل اترا ہوا ہے وہ تو جیتے جی مر جائے گا... اور یہ آس تو آپ نے ہی دلائی ہوئی تھی، نہیں تو میری گھر والی کبھی اتنا منہ پھاڑ کر ان کو نہ کہتی"۔

غلام محمد نے اضطراری طور سے سر سے اپنی پگڑی کو اتار کر جھاڑ اور پھر باندھنے لگ گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ اور مایوسی نے اندھیرا سا کر دیا تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا اور اکا دکا بادل بے رنگ سیاہی میں بدل گئے تھے۔ ابھی بھی پروا کی تیز تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور دور درختوں پر کوے تیز آواز میں کائیں کائیں کر رہے تھے۔

دلاور خاں کا بوڑھا باپ لاٹھی ٹیکتا ہوا مسجد کو جاتے ہوئے ان خاموش لوگوں کے پاس رک گیا۔ اس کی جھکی کمر کو لاٹھی نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کا سفید سر ہل رہا تھا وہ سب خاموش تھے۔

"بابا جی! چودھری جی کہتے ہیں انکار آپ نے کیا ہے، انہوں نے نہیں مجھ غریب کی لاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کیا منہ لے کر واپس گاؤں جائیں گے"۔ غلام محمد نے آگے بڑھ کر بابا کی لاٹھی کو پکڑتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔

بوڑھے بابا نے ان سب کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔

وہ سب نظریں نیچی کئے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ لاٹھی پر جھکا کتنی ہی دیر وہاں سب کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

"بات سنو غلام محمد! جا کر چودھری مہمند خاں سے کہنا، ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ ہمیں اس کی ان گنت زمینوں کی پروا نہیں۔ ہمیں اس کی فصل بھری کوٹھڑیوں کی خواہش نہیں۔ ہمیں اس کے دودھ دیتے جانوروں کا دودھ نہیں چاہیے۔ یہ سب چیزیں ہمارے پاس بھی ہیں۔ ہم بھی اتنے ہی مغرور ہیں، جتنے وہ۔ کیا مہمند خاں خود نہیں آ سکتا تھا؟ ہم سب مل کر بات کرتے یہ دلاور خاں کی بیٹی کی بات ہے کسی کمی کمین کی نہیں..."

"چودھری جی ہمارے گاؤں میں تو ایسا رواج نہیں ہے... رشتے ناطے ہمیشہ دوسروں نے ہی کیے ہیں اور بڑوں نے اسے منظور کیا۔ آپ بھی تو جانتے ہیں..."

غلام محمد نے آگے بڑھ کر اس بوڑھے شخص کی راہ روک کر منت کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس بوڑھے شخص کا جو برگد کی طرح اجاڑ، لیکن باوقار لگ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں سوچوں کی گہرائی تھی اور دماغ میں زمانوں

کا تجربہ۔

"مجھے نماز سے دیر ہو رہی ہے غلام محمد، انکار انکار ہے... ہماری چیز ہے، چاہے دیں چاہے نہ دیں"۔

اور بوڑھا بابا لاٹھی پر سہارا لیے باہر کو چل پڑا۔

وہ سب وہاں نیم تلے چھائے اندھیرے میں چارپائیوں پر خاموش بیٹھے تھے۔ چلم میں دہکتے اُپلے راکھ بنتے جا رہے تھے۔ اندر بھاگاں سر جھکائے سوچوں میں ڈوبی تھی۔ وہ اس گاؤں کی بیٹی تھی۔ وہ اس چودھری کی بیٹی تھی۔ آج بھی سسرال وداع ہوتے وقت کا وہ بزرگ ہاتھ اس کے سر پر دھرا لگتا تھا جو گاؤں کے باہر اس نے اپنے سر پر محسوس کیا تھا، جس نے کہا تھا۔

"بیٹی جاؤ! خدا تمہیں خوش رکھے، شوہر کی خدمت کرنا اور سسرال میں ہمارا نام اونچا رکھنا۔ کوئی یہ نہ کہے حفیظ خاں کے گاؤں کی بیٹی کیسی نکلی"۔

اور اس نے روتی آنکھوں کے ساتھ پیچھے چھٹتے گاؤں کو ڈولی کی اوٹ سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ان سب لوگوں کو تصور میں اس گرد

آلودراہ کے آخری سرے پر کھڑے دیکھا، جو اس کے سسرال کی راہ سے الگ تھا۔ ان میں کھڑا اس کا اپنا باپ بھی تھا۔ بھائی بھی تھے اور گاؤں کا چودھری بھی تھا۔ اس نے تو اتنے عرصہ ان کی لاج نبھانے کے لیے دل پر کئی چرکے سہے تھے اور اُف تک نہ کی تھی۔ اس کو تو اپنے گاؤں پر مان تھا، ان لوگوں پر مان تھا، لیکن آج وہی ہاتھ اس کے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے سسرال گاؤں اکیلی رہ گئی تھی۔

''کیا میرے میکے گاؤں نے مجھے اپنی بیٹی ماننے سے انکار کر دیا ہے؟ کیا میرے دل کے اندر کی وہ تمام طاقت ختم ہو جائے گی، جو چکی پیستے، اپلے تھاپتے، گھر کا کام کرتے اس نے اپنے اندر محسوس کی تھی''؟

وہ اکیلی تو نہیں، محبت کرنے والے انسانوں کا پورا گروہ اس کے ساتھ ہے۔ چودھری کی بیوی نے اس کو دیکھ کر کہا تھا۔

''بیٹی بزرگوں کا فیصلہ ہے۔ میں مجبور ہوں، چودھری بھی مجبور ہے، ورنہ مہمند خاں کا گھر کوئی معمولی گھر تو نہیں۔ میری بیٹی کے نصیب نہیں تھے! ورنہ بابا جی کیوں انکار کرتے''۔

بھاگاں نے ہاتھ ملتے کہا تھا۔

"سوچو تو ماسی، وہاں میرے سسرال گاؤں، مہمند خاں کے گھر سب لوگ اکٹھے ہیں۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے تھان بھر گئے ہیں۔ دس دنوں سے گاؤں کی عورتیں ڈھولک بجا رہی ہیں۔ منوں اناج روز پکتا ہے۔ کل وہ میری راہ دیکھیں گے۔ میں کیا منہ لے کر واپس جاؤں گی۔ وہ پل پہل میرا انتظار کریں گے۔ کچھ تو سوچو ماسی! میری لاج رکھ لو، چودھری نے تو بڑے سچے دل سے میرے ساتھ بات کی تھی"۔

بھاگاں نے پلو سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا تھا۔ تاک میں دیا بھک بھک کر کے جل رہا تھا۔ شاید تیل ختم ہو رہا تھا۔ دلاور خاں کی بیٹی نے پچھلی کوٹھڑی سے جھانک کر دیکھا اور پھر دبے قدموں آ کر تیل کی بوتل دیے میں انڈیل دی۔ بھاگاں نے اس کے لمبے تتنے قد کو دیکھا۔ دیے کی لو میں اس کا چہرہ کندن کی طرح روشن لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ادا کی تھی۔ اس نے دوپٹے کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

بھاگاں کو اپنا وہ وجود یاد آ گیا جو کنواری سرسوں کی باس کی طرح

آج بھی کبھی کبھی اسے یاد آجاتا تھا۔

"میں نے تو اپنے سسرال گاؤں اپنا رشتہ مضبوط کرنا چاہا تھا۔ میں نے سوچا تھا جب چودھری کی بیٹیہ اس گاؤں آجائے گی، تو اکیلی نہ رہوں گی... ہم دو ہو جائیں گی... میں اور زینب... میں ایک غریب کی بیٹی اور زینب چودھری کی بیٹی۔ لیکن پھر بھی ہم ایک ہی تو ہیں۔ ایک ہی گاؤں کی بیٹیاں۔ ہمارا رشتہ تو سب سے مضبوط ہے۔ ایک زمین کا تعلق"۔

اس نے اٹھ کر زینب کے سر پر پیار دیا تھا۔ زینب کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اس نے چودھری کی بیوی کو مڑ کر دیکھا۔ چودھری کی بیوی اداس تھی۔

"ماسی کیا کرے۔ ماسی بھی تو مجبور ہے"۔ بھاگاں نے دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے دل میں کہا۔

باہر اندھیرا گہرا تھا اور نیم تلے بیٹھے لوگ ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ رشید خاں اور دلاور خاں اب بھی بیٹھے تھے۔ غلام محمد کی پگڑی اس کے سامنے دھری تھی۔ اس کی نئی جوتی گرد آلود تھی۔ اس کو حقے کی طلب ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے آگے بڑھ کرنے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے دل میں سب

اتنا ویران اور اجاڑ لگ رہا تھا۔

چودھری سرور علی کے گھوڑے کی ٹاپ حویلی کے دروازے پر آ کر رک گئی تھی۔ رشید خاں اور دلاور خاں نے اپنے جھکے سر اوپر اٹھا لیے۔ غلام محمد تنکے سے زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔ اگر رات نہ ہوتی تو وہ اور بھاگاں کب کے واپس چلے گئے ہوتے۔ اس نے بڑے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے دل میں سوچا ہم اب بھی جا سکتے ہیں۔ بھاگاں تو مجھ سے بھی زیادہ دل گردے والی ہے۔ اور یہ راہ بھی تو اپنی جانی پہچانی ہے لیکن آنے اور جانے میں کتنا فرق ہے۔ اس نے سرور علی کے آنے پر اٹھ کر سلام کرتے ہوئے سوچا تھا۔

"بیٹھو غلام محمد بھٹی تم تو ہمارے داماد ہو، بھاگاں ہماری بیٹی ہے ہمارے سر آنکھوں پر سرور علی چودھری نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ نوکر نے تازی چلم بھر دی تھی۔ اس کی چنگاریوں میں ان کے چہرے سوچوں سے بوجھل تھے۔

فصلوں کی باتیں منڈی کے بھاؤ، آنے والے میلے کے مقابلے... اور غلام محمد خاموش بیٹھا یہ سب سنتا رہا تھا۔ وہ کل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ان اونٹوں اور گھوڑوں کے نہانے کی آوازیں سن رہا تھا، وہ لٹھے کی کھڑ کھڑ کرتی دھوتیوں کی سرسراہٹ سن رہا تھا۔ وہ عورتوں کی چوڑیوں کی چھن چھن سن رہا تھا۔ وہ بچوں کی چیخوں، قہقہوں اور شور میں اس رونق کو دیکھ رہا تھا جو مہند خاں کی بڑی حویلی کے اندر باہر سب طرف تھی، جو گاؤں کی کچی گلیوں کی دھول میں تھی، جو تنور میں پکتی روٹیوں کی باس میں تھی، جو مہند خاں کے چہرے پر تھی۔ پر کل کیا ہوگا۔ کل کیا ہوگا۔ یہ سب سوچ کر اسے ایسا لگا جیسے اندر سے کوئی اس کے دل کو نوچ رہا ہو۔ لہولہو دل اس کے پہلو میں تڑپ رہا تھا۔

رات سیاہ تھی اور دور اوپر تارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ سرور علی چودھری نے جاتے ہوئے اس کے کندھوں کو دوبارہ تھپکی دی۔ جیسے کہہ رہا ہو حوصلہ کرو، خدا راہ دکھانے والا ہے۔ غلام محمد نے اندھیرے میں چودھری سرور علی کے چہرے کو دیکھنا چاہا تھا پر زیادہ اندھیرا تھا اور آس پاس کوئی روشنی

نہ تھی بس غلام محمد کو ایک دوستی کا احساس ہوا تھا۔ اس تھپکی میں کوئی بات تو ایسی تھی جو اسے گم ہوئی لگتی تھی۔ وہ اس گاؤں میں اب بھی اجنبی اور اکیلا نہیں۔ اس کے اندر سے آواز آئی تھی۔

''مجبوری ہے غلام محمد، بھاگاں ہماری بیٹی ہے۔ اسے لیے آس ہو کر جانا تو نہیں چاہیے تھا، پر حفیظ خاں چاچا پر کسی کا زور نہیں۔ دلاور خاں بے قصور ہے''۔

اس نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے دلاسہ دینے کے انداز میں کہا تھا اور پھر گھوڑا اس بڑے دروازے سے باہر سرپٹ دوڑ گیا تھا۔ تارے اب بھی چمک رہے تھے، لیکن اندھیرا تو اور بھی گہرا ہوتا لگتا تھا۔

امرود کے باغ میں بھاگاں نے ایک درخت کے نیچے اس پوٹل کو رکھ دیا، جس میں ماسی نے ستو، گڑ اور چاولوں کے لڈو باندھ کر زبردستی اس کے ساتھ کر دیئے تھے۔

''بیٹی خالی ہاتھ تو نہیں جاتی۔'' اس نے سر پر پیار دے کر کہا تھا۔

سورج کی تپش بڑھ رہی تھی۔ امرودوں کی باس سب طرف پھیلی

ہوئی تھی۔ سب طرف گرد تھی اور سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے۔

بیس کوس۔ بیس کوس اس کو پیدل چلنا تھا اور اس کے تنے ہوئے جسم کی ساری طاقت نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔

انہوں نے آج مجھے کتنا بے آس کر کے بھیجا ہے بھاگاں نے درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے دل میں کہا تھا۔ اتنی بے آس تو میں زندگی بھر نہیں ہوئی تھی۔ میں ان چیزوں کو لے کر کیا کروں میں جوان کے گاؤں کی بیٹی تھی، ان کی عزت تھی اسے ایسے لگا جیسے رشتے کی وہ ڈوری جو اس گاؤں سے اس کے سسرال تک تنی ہوئی تھی، ٹوٹ گئی ہو، اسے الجھا کر اسے اپنی راہ گم ہوئی لگتی تھی اور پھر اس کا بھرم مہندخاں کو جا کر وہ کیا جواب دے گی۔

غلام محمد بھی چپ تھا۔ راہ کتنی لمبی ہے اور وہ کتنے تھکے ہوئے ہیں۔

بھاگاں چپ چاپ بیٹھی تھی، جیسے اسے اور آگے نہ جانا ہو۔ اس کے دھوپ کی طرح روشن چہرے کی رونق بجھ چکی تھی۔

''بھاگاں کیا آج یہیں رہنے کا خیال ہے''۔ غلام محمد نے بھاگاں کو

بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔ ''گاؤں میں کس منہ سے جاؤں۔ وہ سارے لوگ کیا کہیں گے۔ مہمند خاں کیا کہے گا۔ میں اب گاؤں نہیں جاؤں گی''۔ بھاگاں کی آواز میں آنسوؤں کی رندھن تھی۔

''دلاور خاں نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ میں اب گاؤں نہیں جاؤں گی۔ گاؤں کس منہ سے جاؤں۔ میں گاؤں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی''۔

''بھاگاں اتنا دل چھوٹا نہ کرو، اس میں ہمارا کیا قصور''۔

غلام محمد نے اسے دلاسہ دینا چاہا تھا، لیکن اس کی اپنی آواز بھی تو بڑی بے جان تھی۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ باغ میں حبس تھا، لیکن بھاگاں ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

رات جب گاؤں کی کچی گلیوں میں اتر رہی تھی تو بھاگاں اور غلام محمد اپنے گھر پہنچے تھے۔ آج وہ اس طرح گاؤں آئے تھے جیسے انہوں نے کوئی گناہ کیا ہوا اور انہیں اپنے سنگسار کئے جانے کا ڈر ہو۔

غلام محمد کی بوڑھی ماں نے دیے کی لو کو اوپر کر کے چہروں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ان کو بتانا چاہتی تھی کہ صبح سے مہمند خاں کے گھر سے کتنے لوگ ان کو پوچھنے آئے تھے۔ وہ کئی دفعہ گاؤں کے باہر تک سونی راہ کو دیکھ دیکھ کر پلٹے تھے۔ وہ فکر مند تو ضرور تھے لیکن مایوس نہیں تھے۔ ان کے گھر اب بھی ڈھولک پر گاؤں کی لڑکیاں لہک لہک کر گیت گا رہی ہوں گی اور الاؤ میں شعلے لپک لپک کر باہر نکل رہے ہوں گے۔ نوکر چاکر کاموں میں مصروف ہوں گے۔

پر اس کے بیٹے اور بہو کے چہروں پر لکھی مایوسی اور ناکامی کو اس نے پڑھ لیا تھا۔ اور وہ خاموش بیٹھ گئی تھی۔ بھاگاں نے صحن میں سوئی ہوئی اپنی تینوں بیٹیوں کو ایک نظر دیکھا تھا، لیکن آگے بڑھ کر ان کو ہاتھ سے نہیں چھوا تھا۔ اس کے دل میں اتھاہ مایوسی اور شرمندگی تھی۔ وہ تو کسی ناگہانی آفت کے لئے دعا کر رہی تھی جو اس کو کہیں زمین کی اتھاہ تہوں میں چھپا دے۔

''دلاور خاں اپنی زبان سے پلٹنے والا تو نہیں تھا''۔ غلام محمد کی بوڑھی ماں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر خاموش چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔

وہ اندر بیٹھے تھے، اندر گرمی اور حبس تھا۔ باہر صحن میں فرفر ہوا چل رہی تھی لیکن انہیں باہر جاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اگر مہمند خاں کے گھر سے آئے آدمی نے انہیں دیکھ لیا تو وہ کیا جواب دیں گے۔

اور پھر آدھی رات کو جب گھڑیاں اپنے اختتام کی طرف سفر کر رہی تھیں کھیتوں سے گیدڑوں کی تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز ان کے دروازے پر رُکی۔

''یہ کون ہو سکتا ہے''؟ غلام محمد نے آہستہ سے کہا۔ اتنی رات گئے کون دور کا سفر کر کے آ سکتا ہے؟

دروازہ کھٹکھٹانے پر غلام محمد نے دروازہ کھولا تو تین گھوڑے سر جھکائے کھڑے تھے جیسے تیز بھاگنے سے تھک گئے ہوں۔ ان کے نتھنوں سے سانسوں کی تیز آواز آ رہی تھی۔

اندھیرا تاروں کی روشنی میں ملگجا سا ہو گیا تھا۔ پھر بھی ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے گھوڑون سے اتر کر غلام محمد کو سلام کیا۔

”آپ کون ہیں اور کہاں سے اتنی رات گئے آئے ہیں“؟ غلام محمد نے شک بھری آواز میں پوچھا۔

”یار اندر تو آنے دے بتا بھی دیں گے“۔ انہوں نے کھلے دروازے سے گھوڑے اندر لاتے ہوئے کہا۔

بھاگاں، اس کی ساس اور سسر کھڑے تھے۔ بھاگاں نے دیئے کی لوکو اونچا کر کے ان کے چہروں کو دیکھا تھا۔

”چودھری جی آپ“۔ بھاگاں نے سرور علی چودھری کو پہچان کر پریشان ہو کر پوچھا تھا۔

”بیٹی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔اتنی رات گئے آنے کا کوئی مطلب تو ضرور ہو گا“۔سرور علی نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

بھاگاں کی ساس نے کھری کھاٹ پر دوتہی بچھاتے ہوئے انہیں بیٹھ جانے کو کہا۔وہ تینوں بیٹھ گئے۔

غلام محمد نے گھوڑوں کے آگے اپنی بھینس کے سامنے سے اٹھا کر چارہ ڈال دیا تھا اور وہ مطمئن ہو کر کھا رہے تھے۔

چودھری سرور علی کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔

''سنو بھاگاں بیٹی، میں آدھی رات کو اس لیے آیا ہوں کہ اس جھولی کو بھر دوں جو حفیظ خاں چاچا نے خالی ہی بھیج دی تھی۔ تم میرے گاؤں کی بیٹی ہو اور میکے گھر سے بیٹیاں خالی ہاتھ واپس آتی اچھی نہیں لگتیں۔ کیا ہوا اگر دلاور نے تمہیں مایوس کر دیا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے باپ کے انکار کے آگے مجبور ہو۔ تم ہماری لاج ہو، ہماری عزت ہو۔ تمہاری عزت ہماری عزت ہے۔ ہم سب کی۔ اور میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ تمہارے سسرال والے تمہیں طعنہ دیں کہ میکے گاؤں تمہارا بھرم نہ رکھا گیا۔ میں اپنی بیٹی کا شگن تمہاری جھولی میں ڈالنے آیا ہوں۔ اس سے تمہارے بہتے آنسو رک جائیں گے۔ تمہارا بھرم ٹوٹے گا نہیں اور کوئی ہمارے گاؤں کو طعنہ نہیں دے گا کہ بیٹیوں کا بھرم نہیں رکھتے۔ ٹھیک ہے نا بیٹی''۔

سرور علی نے گڑ کی بھیلی اور دس وا پانچ روپے اس کی پھیلی جھولی میں ڈال دیئے تھے۔ بھاگاں کا دل اچھل کر اس کے پہلو سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس بزرگ انسان کے گلے لگ کر خوشی سے زور زور سے

روئے۔ بھاگاں جیسے وہ اپنے بوڑھے باپ کے گلے لگ کر روسکتی تھی۔ اس کی جھولی خالی نہیں تھی۔ اس میں زمانے بھر کا بھرم تھا۔ اس کا ٹوٹا وقار اور عزت تھی۔ اس کا میکہ تھا۔ وہ کیا نہیں تھا۔ اس نے جھولی کو سمیٹ کر اپنے سے لگا لیا۔

''چاچا جی آپ نے مجھے دوبارہ زندگی دے دی ہے''۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ اس کا دل احسان مندی سے لبالب بھر گیا تھا۔

چودھری سرور علی نے اٹھتے ہوئے کہا تھا'' اب ہم چلتے ہیں۔ آج ہی کے دن مہمند خاں سے کہنا برات لے کر آجائے۔ اپنی امید سے زیادہ پائے گا''۔

انہوں نے گھوڑوں کو کھول کر اندھیرے میں باہر جاتے ہوئے ان چاروں انسانوں کو دیکھا تھا۔ جن کے دل لشکر سے اور آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اندر دیئے کی لو مدھم ہو کر بجھنے کے قریب تھی۔ ہوا میں نمی تھی۔ دور کسی گھر سے مرغ کی تیز آواز آئی۔

''ہاں صبح بے شک ہو جائے۔'' بھاگاں نے گھڑے سے گلاس میں

پانی ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ہاں صبح ابھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ کیا ہم اسی وقت مہمند خاں کے گھر نہ چلیں؟ وہ ہمارے انتظار میں نہ جانے کتنے فکرمند ہوں گے"۔ بھاگاں نے غلام محمد کو اپنی نئی جوئی صاف کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

اس نے ہنس کر بھاگاں کو دیکھا۔"بڑی جان پڑ گئی ہے۔ صبح تو ہونے والی ہے۔ اس رات بھر کے فکر نے تو مجھے بوڑھا بنا دیا ہے۔ لو تو ہو لینے دو"۔

"ابھی سے بوڑھے ہونے لگے تو بیٹیوں کی فکر کون کرے گا"۔ بھاگاں نے سوئی بیٹیوں کو دیکھ کر کہا۔

"جس طرح رب کا فضل اب ہوا ہے اسی طرح پھر بھی امید رکھنی چاہیے"۔ غلام محمد نے آسمان کے کناروں سے پھوٹتی سفیدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

بھاگاں کی ساس نے لسی کا گلاس غلام محمد کو دیتے ہوئے کہا تھا"۔ بھاگاں تو بڑی نصیبوں والی ہے، غلام محمد، خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ فکر کرنے

والا وہ خود ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں۔ ہم خاک کے پتلے"۔

غلام محمد نے بھاگاں کو دیکھا اور پھر اس کے دل میں محبت اور خوشی کی روشنی پھوٹ نکلی۔ بھاگاں جیسی عورت اس کے نصیب میں لکھی تھی۔ خدا بڑا اچھا ہے۔ گاؤں کی گلیاں جاگ رہی تھیں۔ دودھ ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں، کھیتوں کو جاتے بیلوں کے گلوں میں بجتی گھنٹیاں۔

بھاگاں نے اپنے ماتھے پر بالوں کو جماتے ہوئے دھندلے سے آئینے میں چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ غلام محمد ابھی مسجد سے واپس نہیں آیا۔ اس کی بیٹیاں بھی ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ جب غلام محمد ابھی مسجد سے واپس نہیں آیا۔ اس کی بیٹیاں بھی ابھی تک سوئی ہوئی تھیں۔ جب غلام محمد آیا تو اس کے ساتھ دلاور خاں بھی تھا۔ بھاگاں نے حیران ہو کر ان کو دیکھا اور خاموشی سے کھاٹ بچھا دی۔

دلاور خاں نے اس کے سر پر پیار دیا تھا اور شرمندہ سا بیٹھ گیا تھا۔ غلام محمد نے بھاگاں کو دیکھا اور بھاگاں نے جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

”بھاگاں بیٹی ناراض لگتی ہو۔ دیکھو میں آخر اپنے بابا کو منا کر آ ہی گیا ہوں“۔

”چودھری جی آپ دیر سے آئے ہیں۔ میں نے تو شگن لے بھی لیا ہے“۔ بھاگاں نے بڑی مشکل سے کہا۔

”کون شگن دے گیا ہے“؟ دلاور خاں کی آواز میں بے یقینی تھی۔

بھاگاں چپ تھی۔ وہ دلاور خاں کو بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن وہ صرف یہ کہہ سکی۔ ”چودھری سرور آدھی رات کو آ کر اپنی بیٹی کا شگن دے گئے ہیں“۔

دلاور خاں چپ ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

”چودھری جی آپ نے مجھے بے آس کر دیا تھا۔ میں آپ کی بیٹی تھی۔ آپ نے جواب دیتے وقت یہ نہ سوچا کہ یہ میری عزت کا سوال ہے۔ میرے مان کا سوال ہے۔ میرے میکے کی آبرو کا سوال ہے۔ آپ نے بیٹی کو اپنے گھر سے خالی ہاتھ واپس بھیج دیا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے۔ چودھری

سرور علی کی بھی میں بیٹی ہوں۔ مجھے آپ نے واپس لوٹایا، لیکن ان کے دل میں خدا نے رحم ڈال دیا"۔

بھاگاں کا دل کرتا تھا کہ وہ بولتی جائے۔ وہ وسب باتیں کہہ دے جو اس کے دل میں بھری پڑی تھیں۔ غصیلی اور تیکھی باتیں۔ اس نے گڑ کی بھیلی اور سوا پانچ روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیئے۔

"اب آپ ہی بتایئے چودھری جی میں کس کا شگن لوں اور کس کا لوٹا دوں۔ انصاف آپ ہی کریں۔ میں آپ کی بات مان لوں گی، پر انصاف ضرور کریں"۔

دلاور خاں خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر سفر کی تھکن نظر آ رہی تھی۔ اس نے سورج کو دیکھا۔ اپنے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی اور کھڑا ہو گیا۔

"میں شرمندہ ہوں بھاگاں بیٹی۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ سرور علی نے گاؤں کی لاج رکھ لی۔ اس نے گاؤں کی بیٹی کی لاج رکھ لی اور ہم سب پر احسان کیا ہے۔ پر اب سارا معاملہ تم پر ہے۔ تم جو چاہو اب بھی کر سکتی ہو۔

غلام محمد چپ تھا۔ بھاگاں نے دلاور خاں کے چہرے پر لکھی مایوسی کو دیکھا اور پھر اس کو اپنی مایوسی بھی یاد آ گئی۔

"چودھری جی سرور علی چودھری کی بیٹی بھی آپ کی اپنی ہی بیٹی ہے۔ میرے گھر آ کر جو عزت دار شگن دے کر گیا ہے، میں اسے کس منہ سے لوٹا دوں۔ میں نے آپ کے گھر جا کر شگن مانگا تھا اور آپ نے نہیں دیا تھا اور چودھری صاحب میرے گھر آ کر دے گئے ہیں"۔

"بیٹی بھاگاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں دیر سے پہنچا ہوں۔ مجھے واپس جانا ہی ہوگا"۔ اس نے تولیے کو جھاڑ کر کندھے پر رکھا۔ اپنی پگڑی کو دوبارہ باندھا اور بوجھل قدموں سے دروازے کے باہر نکل گیا۔ بھاگاں کتنی ہی دیر اپنے سامنے پڑی گڑ کی بھیلی اور روپوں کو دیکھتی رہی۔ فیصلہ اسے کرنا ہے۔ دلاور خاں نے یہی کہا تھا۔ "وہ کیا فیصلہ کر سکتی ہے، اسے کیا فیصلہ کرنا چاہیے"۔ اس نے بے چینی سے سوچنا چاہا تھا۔ دلاور خاں کی بیٹی کی کندن جیسی رنگت اور سرو جیسا قد اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

"سرور علی کی بیٹی۔ فاطمہ اور زینب۔ نہیں مقابلہ فاطمہ اور زینب میں

نہیں۔ بھاگاں اور دلاور خاں کے وقار میں ہے اور دلاور خاں کو بھی اسی مایوسی سے واسطہ پڑے گا، جیسا دکھ میں چکھ چکی ہوں“۔ دور سے زور زور سے ڈھول کی آواز آنے لگی۔ پھر اس کے دروازے پر میراثی ڈھول پیٹ رہا تھا۔ اس نے ان منے دل سے گڑ کی بھیلی اوعر روپوں کو بڑی سی سینی میں رکھا۔

”مہمند خاں والوں کو سرور علی کا رشتہ بھی منظور ہے۔ بھاگاں بڑے گاؤں کے چودھریوں کی بیٹیان بڑی کرموں والی لگتی ہیں۔“ غلام محمد نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

”کیا میں تجھے کرموں والی نہیں لگتی۔“ بھاگاں نے سینی کو سر پر اٹھایا اور گاؤں کی عورتوں کی طرف جاتے ہوئے غلام محمد کی طرف تیکھی نظروں سید دیکھ کر پوچھا تھا۔ ”بھاگاں تم سچ مچ بھاگاں ہو“۔ غلام محمد نے دل کے اندر چھپی ہوئی تمام محبت کو اپنے الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ بھاگاں نے جواب نہیں سنا تھا۔ وہ تو عورتوں کے ہجوم میں کڑ مائی کے گیت گاتی مہمند خاں کی حویلی کو جارہی تھی۔

بڑے گاؤں کی بیٹی۔

بُجھے دیئے

پُروا ہوا کے جھونکے کھیتوں میں پڑے گندم کے ڈھیروں کو چھوتے
ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پورا چاند بوڑھے پیپل کی شاخوں میں اس
طرح اٹکا ہوا ہے جیسے کسی کنواری کے رنگین دوپٹے میں موتی۔ گندم پھٹکنے
والی عورتیں اورمرد چھاجوں کو سروں سے اوپر کئے گندم اور بھوسہ الگ کر
رہے تھے۔ دوسری طرف گندم کے ڈھیر پر بیلوں کے گلوں میں بندھی

گھنٹیوں کی آواز ایک تان کی صورت میں آ رہی ہے جیسے پراسرار روحیں کسی ان دیکھے دیوتا کی عبادت میں مصروف ہوں۔ چاند آہستہ آہستہ شاخوں سے اونچا اُٹھ رہا ہے اور کھیتوں کے مغربی کونے کی طرف اونچے ٹیلے پر تین پکی قبروں کے دیئے ٹمٹما رہے ہیں۔ ان قبروں کی سفیدی بارشوں کی وجہ سے دُھل گئی ہے۔ گھسی ہوئی سرخ اینٹیں اونچی نیچی ہو گئی ہیں۔ سر کی طرف کے کتبے کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے ہیں۔ دیئے مٹی اور تیل کی وجہ سے سیاہ ہو گئے ہیں۔ ان قبروں تک ہی میرے کھیتوں کی حد ہے۔ اس کے آگے کوئی کھیت نہیں۔ بہت بڑا میدان ہے۔ یہ زمین نہ جانے کس کی ہے۔ اس میں آج تک کسی نے ہل نہیں چلایا۔ اس میدان کے پار کوئی گاؤں بھی نہیں ہے۔ صرف گرمیوں کی راتوں کو گاؤں کی بہو بیٹیاں کافی رات گئے تک ناچتی گاتی اور باتیں کرتی رہتی ہیں۔ یہ تینوں قبریں میرے کھیتوں اور میدان کے درمیان ایک حد کا کام دیتی ہیں۔ ادھر کھیتوں کی منڈیروں پر سے سبزہ بڑھتا بڑھتا ان تک آ گیا ہے۔ برسات کے دنوں میں تو اینٹوں کے درمیان میں سے بھی ہریالی جھانکنے لگتی ہے۔ دیئے کچھ پل جلتے ہیں اور بجھ جاتے ہیں۔

ان قبروں کے متعلق کوئی ایسی کہانی مشہور نہیں جن کی وجہ سے راہ گیر ادھر سے آتے ہوئے ڈریں یا گاؤں کی عورتیں ان کی طرف دیکھ کر چیخیں یا روتی ہوئی واپس بھاگ جائیں۔ یہاں تو دن کے وقت بھی بچے درختوں پر سے شہتوت اُتارنے آتے ہیں اور قبروں کے اوپر یا ادھر ادھر پڑے ہوئے شہتوت مزے لے لے کر کھا رہے ہوتے ہیں۔ یہ تینوں قبریں ایک جیسی بوسیدہ حالت میں ہیں۔

چاند اب اوپر بڑھ آیا ہے۔ کام کرنے والے تھک کر ایک طرف بیٹھ گئے ہیں۔ چھاج بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ہیں۔ عورتیں لسی کے خالی برتن اور روٹی کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو سنبھال کر ایک طرف رکھ رہی ہیں۔ ان کے پلو ایک مدھم سی آواز کے ساتھ پھٹ پھٹا رہے ہیں۔ اس طرح جیسے ابھی وہ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں اڑتی ہوئی غائب ہو جائیں گی اور یہ بیٹھے ہوئے مرد ان کو ڈھونڈنے کے لئے صحراؤں کی خاک چھانتے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ زندگی پُرسکون اور ابدی نظر آ رہی ہے مگر ان قبروں پر جلتے دیئے بجھ گئے ہیں۔ شہتوت کے درختوں میں الو کرخت

آواں میں چیخ رہا ہے۔ نورا ہیر گا رہا ہے۔ اس کی آواز ہوا کے ساتھ کٹے ہوئے کھیتوں پرے ہوتی ہوئی دور جا رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں نورے سے چلا کر کہوں۔ ہیر تو کوئی بھی نہیں تھی۔ وہ صرف خیالوں میں وجود میں آئی ہے اور بس۔ یہ کون سی ہیر کے قصے تم بیان کر رہے ہو، لیکن میں یہ بات تو اپنے دل سے بھی نہیں کہہ سکتا۔ میرا دَم گھٹنے لگتا ہے نورے کی آواز اور تیز ہوتی جا رہی ہے۔ نورا ہیر گا رہا ہے، کیونکہ وہ ابھی تک کسی ہیر کے پیچھے نہیں بھاگا۔ اس کی ہیر تو کتاب کے صفحوں میں قید ہے، مگر میں نے تو کتنی ہی بار زہر کھائی ہے۔ میں نے تو کتنے روپ دھارے ہیں۔ کتنی ہی بار سادھوؤں کا بھیس بدلے گلی گلی گھوما ہوں۔ مجھے کبھی بھی وہ ہیر نظر نہیں آئی اور یوں زمانے ہی بیتے جا رہے ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں خوبصورت خواب دیکھے ہیں جہاں ایک گھر کے صاف ستھرے آنگن میں چوڑیوں کی جھنکار ہو گی۔ دو مدھر آنکھیں کھلے دوار تک میرا پیچھا کریں گی، جب میرے گھر کے سامنے میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھم جائے گی تو دروازے کی اوٹ سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر لگام تھام لیں گے اور آج میں ان کھیتوں کے

کنارے کنارے قدم قدم پھرتا سوچ رہا ہوں میں نے اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے کے لئے کیا چیز چنی تھی۔ میں نے تلوار کی نوک سے اس تصویر کو گہرا کھودنا چاہا اور نتیجہ میں سارے پر ہی خون بھر گیا۔ سب نقوش گڑ بڑ ہو گئے سب چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ ہر طرف سرخی ہی سرخی نظر آئی۔ جس میں میرے بھائی کا، زینو کا اور نہ جانے کس کس ک کا خون شامل تھا۔ اس خون کو ایک دوسرے میں ملنے سے روکنے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ سب باتیں، سب دھاگے آپس میں بُری طرح اُلجھ گئے کہ کسی ایک کو علیحدہ کرنا آسان نہ تھا۔

جب میں اور شیر بخت گاؤں کی کچی گلیوں میں پھرتے پھراتے باپ کے کندھے برابر پہنچ گئے تو زندگی میں عجب طرح کی خوبصورتی نظر آئی۔ میرا گھوڑا گرد اڑاتا دور اُفق میں گم ہو جاتا، خون رگوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ درختوں کے سائے ٹھنڈے محسوس ہوتے۔ پاس بہتے دریا کی گہرائی ہاتھ برابر لگتی۔ کچھ انوکھا حیران کن کام کرنے کو دل کرتا۔ شیر بخت جب میرا یہ جوش دیکھتا۔ تو ہنس کر کہتا۔ ''زندگی تحمل سے گزارنی چاہیے۔

اس جوش کو کسی بہتر کام پر لگاؤ۔ خواہ مخواہ گھوڑوں کی شامت لاتے ہو۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیتوں میں ہی آ جایا کرو۔ خاک اُڑاتے گھومتے پھرتے رہتے ہو"۔ تو میں زور سے ہنس دیتا۔ "کیا میں بھی تمہاری طرح گھوڑے کو گدھا سمجھ کر ٹخ ٹخ کرتا ہوا چلا کروں۔ اس طرح بولوں جیسے کوئی مٹیار شرما کر بولتی ہو۔ اس طرح گاؤں جیسے مولوی صاحب کسی کی نماز جنازہ کروا رہے ہیں۔ نہیں بھئی میں اس طرح نہیں کر سکتا اور میں گھوڑے کو تھپکی دیتا ادھر ادھر سوار ہو کر چلا جاتا۔ آج جب یہ سب باتیں یاد آ رہی ہیں تو ایسے لگ رہا ہے یہ تو اونگھتے ہوئے دیکھے ہوئے سپنے ہیں جب ایک ہی جھپکی میں ایک دنیا میں گھوم آتے تھے۔ اب گھوڑے کی باگوں پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی اور حقیقتیں بھی محض افسانہ لگتی ہیں۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ کھیتوں پر گھومتے، دوستوں میں گپیں ہانکتے دنیا بہت ہی خوبصورت لگتی۔ گھوڑے کو ایڑ لگا کر تیز دوڑاتے ہوئے میں بھی اپنے آپ کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر سنی کہانیوں کا شہزادہ سمجھتا جو کسی جنگل میں قید شہزادی کو رہا کرانے جا رہا ہو۔ یہ سب میرے اپنے سپنے تھے۔ ان

سب باتوں میں شیر بخت کبھی میرا ساتھ نہ دیتا۔ وہ گھر میں بیٹھا ہیر پڑھتا۔ ابا کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتا۔ ڈھورو ڈنگروں کے چارہ پانی کی فکر کرتا۔ شیر بخت مجھ سے بڑا جو تھا۔ ابا ہنس کر کہتے۔ ''چار دن اسے ابھی اور موج اڑانے دو۔ جوان خون ہے پھر تو اسے بھی تو یہی کرنا ہے''۔ اور آج زندگی ان کھیتوں تک ہی ہے اس کے باہر میرے لئے کوئی دنیا نہیں۔ کوئی آسمان اور زمین نہیں۔ ان میں ہی میرا ماضی ہے اور ان میں ہی میرا آنے والا زمانہ ہے۔ شیر بخت بھی میری مدد کو کبھی نہیں آیا۔ کیونکہ میں نے زندگی میں دوسروں سے الگ راہ چلنے کی کوشش میں اپنے اور ان کے درمیان اپنے ہاتھوں سے خود ایسی خندق بنائی ہے جس کو پاٹنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں اس کنارے سے دوسرے کنارے کو بیٹھا کب سے دیکھ رہا ہوں۔ مگر دوسرا کنارہ مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ آنے والے زمانے پر دھند کی ایک ایسی تہہ چھائی ہے جس میں سورج کی ایک کرن بھی گھس نہیں سکتی۔ خندق کے اُس پار شیر بخت ہے۔ ماں ہے، زینو ہے۔ میں تو زمانوں سے ان کو آوازیں دے رہا ہوں، مگر میری آواز تو مجھے بھی سنائی نہیں دیتی اور دھیمی طبیعت والا

شیر بخت وہاں بھی خاموشی سے ہیر پڑھتا ہوگا۔ ہیر کے ساتھ تو اسے عشق تھا، مگر اس کی آواز کبھی بھی نورے کی آواز کی طرح اونچی نہ ہوئی۔ ہاں کبھی کبھار جب شیر بخت دوسرے گاؤں ابا کا کوئی پیغام لے کر بہت خوش خوش واپس آتا۔ اس دن کچھ دیر وہ چوپال بھی چلا جاتا یا پھر ذرا اونچے سُروں میں ہیر گاتا۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں اس کی تبدیلی کا اندازہ کرسکوں۔ کبھی کبھی وہ بغیر بتائے کہیں چلا جاتا۔ ماں رات اس کا انتظار کرتی رہتی۔ بار بار چولہے پر پڑے ہوئے ساگ کو دیکھتی۔ ابا کھیتوں پر ہوتے۔ اس کے آنے پر اگر ماں کبھی سختی سے پوچھتی تو کہتا۔ ”ماں آخر میں بھی انسان ہوں۔ کبھی کبھی گھومنے کو دل کرتا ہے۔ تو ادھر ادھر جاتا ہوں“۔ ماں ہنس کر چپ ہو رہتی۔ اب وہ آگے سے زیادہ کام کرتا۔ رات گئے تک کھیتوں میں رہتا۔ جب بھی آتا، اس کا گھوڑا ہانپ رہا ہوتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک گہری ہوتی جا رہی تھی۔

ایک رات جب آسمان پر جھیر جھیر بادل چھائے تھے۔ جیسے کسی کنواری کی چیزی کانٹوں میں اُلجھ کر پھنس گئی ہو۔ پہلی رات کا چاند ابھی گھر

کے پچھواڑے بہت نیچے تھا۔ ابا شہر سے واپس آئے تو بہت بُری طرح زخمی تھے۔ پشت پر سے بہتے ہوئے خون سے جوتی کی ایڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ چہرہ سرسوں کے پھولوں کی طرح زرد تھا۔ ڈاکوؤں نے لوٹ کر زخمی کر دیا تھا۔ شیر بخت کھیتوں پر ہی تھا۔ ماں ابا کی یہ حالت دیکھ کر بے ہوش زمین پر گر پڑی۔ غصے اور جوش سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں ابا اور ماں کو اسی حالت میں چھوڑ کر حکیم جی کے گھر چل پڑا۔ حکیم جی صبح سے دوسرے گاؤں کسی دوسرے مریض کو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بادل گہرے ہو گئے تھے۔ میں گلیوں میں بھاگ رہا تھا۔ واپس آ کر گھوڑے کو کھولا، تو شیر بخت آ چکا تھا۔ میں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا دوسرے گاؤں پہنچا، تو رات کافی بیت چکی تھی اور آسمان صاف ہو چکا تھا۔ حکیم جی کو اپنے پیچھے بٹھا کر جب میں تیزی سے واپس آ رہا تھا۔ تو درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتے ہوئے راستے میں ایک گھوڑے کی زد میں آتے آتے بچا۔ اس لمحے مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں تو اُڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتا تھا، مگر میں نے گھوڑے کو روکا اور پاس جا کر اس کو پوچھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں

خوف اور ڈر سے بھری تھیں۔ چاند کی کرنیں شاخوں میں سے لہر دوڑ گئی۔ باگ ہاتھوں سے گر پڑی۔ میری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ سی گئی تھیں۔ وہ چاند کی روشنی میں آسمان سے اُتری ہوئی حور، کی مانند نظر آ رہی تھی۔ میں اپنی بے خودی پر خود حیران تھا۔ میرا دل اسے ہمیشہ اسی طرح دیکھتے رہنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے تو گاؤں میں اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے جب مجھے اس بُری طرح گھُورتے ہوئے دیکھا۔ تو غصہ سے منہ پھیر کر آگے کو چل دی۔ حکیم جی کی آواز سے جب میں چونکا تو وہ کافی آگے جا چکی تھی۔ میں شرمندہ ہو کر ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا۔ ''حکیم جی یہ تو شاید کوئی چڑیل وغیرہ تھی۔ اتنی رات گئے درختوں کے جھنڈ میں کوئی لڑکی آنے کی ہمت نہیں کر سکتی'' حکیم جی ہنس کر چپ ہو رہے۔ وہ راستے کے موڑ پر غائب ہو گئی۔ میں اس کو روک کو چھونا چاہتا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ کوئی انسان ہے یا آسمانی مخلوق۔ جب ہم گھر پہنچے تو ابا خاموشی سے بستر پر لیٹے تھے اور سارا گھر لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ حکیم جی نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور خاموشی سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کئی مہینے گھر پر موت کے سائے لہراتے رہے۔ ماں

خاموشی سے کام کرتی۔ شیر بخت زیادہ کھیتوں پر رہتا۔ میں بھی اکثر وہیں وقت گزارتا، مگر شام سے پہلے گھر آ جاتا۔ ماں اب رات گئے تک اکیلی رہتی گھبراتی تھی۔ اس تمام عرصہ میں ان درختوں کے درمیان دیکھی صورت میری نظروں میں گھومتی رہتی۔ میں اپنے اس خیال پر خود پریشان تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی اتنا کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ میں نے تو سوچا تھا ایک دو دن بعد میں اس کو بھول جاؤں گا، مگر جتنا بھی اس کو بھولنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی زیادہ یہ خیال میرے ذہن میں مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ میں صرف اسے ایک بار چھونا چاہتا تھا۔ اس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا، مگر وہ نہیں تھی۔ میں گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہتا۔ کھلے دروازوں سے چوری چوری اندر نظر ڈالتا۔ مجھے اپنے پر غصہ آتا۔ میں ذلیل ہو رہا تھا۔ میں جب بھی آنکھیں بند کرتا اس کی صورت میری نظروں کے سامنے ہوتی۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتا یا چاندنی راتوں میں کھیتوں کے کنارے گھومتا رہتا۔ شیر بخت اور ماں میری یہ حالت دیکھ کر پریشان رہتے۔ راتیں تب بھی ایسی ہی ہوتیں، جیسی آجکل۔ مگر ان

راتوں میں تو میں نے اس کو ایک بار دیکھے وجود کی اتنی شدت سے خواہش کی تھی۔ اس کو ایک بار اور دیکھنے کے لئے میں پاگلوں کی طرح راتوں کو گھومتا رہتا۔ میں اسے اپنے وجود میں مدغم کر لینا چاہتا تھا، مگر وہ صورت میرے خیالوں کے علاوہ اور کہیں نظر نہ آتی۔ ایک رات جب دُور سے گاؤں کے اِکا دکا دیئے دکھائی دے رہے تھے۔ سردیوں کی ٹھنڈی ہوا کھیتوں سے شور کرتی گزر رہی تھی اور میں کھیس کو اپنے گرد لپیٹے ایسے ہی کنارے کنارے پھر رہا تھا۔ شیر بخت کسی کام کے لئے گھر گیا ہوا تھا۔ میرا دل ایک انجانے بوجھ کے تلے دب رہا تھا۔ وہ مجھے ایک درخت کے نیچے کھڑی دکھائی دی۔ میرا دل سینے کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل جانے کو تھا۔ میں آگے بڑھ کر اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ میرے اس قدر پاس تھی کہ اگر میں ایک قدم آگے بڑھتا تو اس کے نازک جسم کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر ہوا میں نازک چھڑی کی مانند لہرا سکتا تھا۔ مگر میرے ہاتھ میرے پہلو میں بے جان ہو کر پڑے تھے۔ وہ پیچھے مڑی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے، مگر وہ تیزی سے ایک طرف کو ہٹ گئی۔ میرے منہ پر ایسی ہنسی آئی جیسے کوئی بیمار اپنے سامنے

زندگی کو دیکھ کر مسکرا دے۔ مجھ میں ایک قدم چلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ میں نے درخت کا سہارا لیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ وہ جا چکی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ صبح جب آسمان کے کنارے لال ہونے لگے، تو میں نے اپنے آپ کو درخت کے نیچے بیٹھا پایا۔ میں سوتا تھا یا جاگتا، اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا اور جانتے ہوئے بھی کیا ہوتا۔ اُسے ایک بار چھونے کی خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میں سارا دن بے خیالی سے کھیتوں میں کام کرتا یا گھر سے کھیتوں اور کھیتوں سے گھر کے چکر کاٹتا۔ لوگ سوچتے ابا کی جدائی اور موت نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔ کاش وہ ابا کا دکھ ہی ہوتا تو میں آنے والے حادثوں سے تو بچ جاتا۔ دکھ اور اسے پانے کی خواہش میری زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ زندگی کے کام بڑھنے کے باوجود میں اس خیال کو مٹا نہ سکا۔ میں اس کے تصور کو دماغ سے بالکل نکال دینا چاہتا تھا، مگر بے بس ہو کر رہ جاتا۔ میں تو شیر بخت کو بھی اپنے دکھ میں شریک نہ بنا سکا۔ وہ اسی دھیمے پَن سے زندگی کی ڈگر پر چل رہا تھا۔

زندگی کی ڈگر وہی ہے مگر دل اپنے سکون کھو چکے تھے۔ ماں نے

جب شیر بخت کے بیاہ کی بات کرنی چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ ''ابھی وقت نہیں ماں''۔ اس نے کہا تھا۔ ''ابھی تو مجھے کچھ کمانا ہے۔ میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ دلاور کا بیاہ کر دو''۔ تو میں نے حیران ہو کر جواب دیا۔ ''تو ابھی کروانا نہیں چاہتا تو نہ سہی، مگر میں چھوٹے کا بیاہ کیسے کر دوں۔ پہلے تیری بہو گھر آئے گی اور ابھی تو دلاور بچہ ہی ہے۔ تجھ سے پورے چھ سال چھوٹا ہے''۔ میں شیر بخت سے چھوٹا تھا، مگر میری روح نے دکھ کے کتنے ہی درجے طے کر لئے تھے۔ سردیوں کی راتوں میں کھیتوں میں نکل جاتا۔ وہ دور کبھی کھیتوں کے کنارے کنوئیں کی منڈیر پر یا فصل کے درمیان کھڑی نظر آتی۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھتا، مگر وہاں کوئی بھی نہ ہوتا۔ غصہ میری رگوں میں بڑھتا۔ میں اسے پکڑ کر مَسل دینا چاہتا تھا۔ اس کے وجود کو ختم کر دینا چاہتا تھا، مگر میرے ہاتھ خلا میں ہی رہ جاتے۔ پھر کئی دفعہ میں نے اس کو کھیتوں سے نکل کر تیزی سے گاؤں کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ کہاں جاتی تھی۔ کس کو ملتی تھی۔ اس کو جانے بغیر میں اس مرد کا سب سے بڑا دشمن بن گیا جو اس کو مجھ سے چھین رہا تھا۔ اس کو پانے کی خواہش نے مجھے سب طرف سے بے خبر

بنا رکھا تھا۔ ایک رات جب کالے بادل زور زور سے گرج رہے تھے بجلی چمک کر ایک لحظہ کے لئے سب کچھ روشن کر دیتی، میں کھیتوں کو جانے والی راہ پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ تیزی سے میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک کھیت آگے پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ دوسری طرف سے ایک سایہ بڑھا شدت جذبات سے میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ کھیت کی نالی میں بہتے پانی سے اپنے منہ پر چھینٹے ڈالے اور گھر واپس آ گیا۔

نورے کی آواز تھم چکی ہے۔ وہ سب زمین پر ہی سو گئے ہیں۔ چاند مغرب کی طرف جھک گیا ہے اور ہوا میں بھوسہ ملا ہوا ہے سونے والوں کے چہرے پُر مسرت ہیں۔ جیسے انہوں نے زندگی کی خوشی کا راز پا لیا ہو۔ مگر میں نے اس کو پانے کی دھن میں سب کچھ قربان کر دیا اور آج تک آوارہ روح کی مانند زمانوں کے اوپر منڈلاتا پھر رہا ہوں۔ میری کوئی منزل نہیں جس کی طرف میرے قدم بڑھیں۔ زمانہ میرے لئے تھم چکا ہے۔ میں نے دنیا کو دھوکا دینے کے لئے بھیس بدلے، مگر اپنے اس اندر کو کیا کروں جس نے

ہمیشہ مجھے ڈستا ہے۔ وقت میرے ہاتھ سے گزر چکا ہے اور اب پچھتانے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ پچھتاوا تو اس وقت سے میرے نصیب میں لکھا جا چکا ہے جب ایک رات میں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ میں ہی ان کا قاتل تھا۔ اس روز شیر بخت صبح سے ہی دوسرے گاؤں کسی کام کے لئے گیا ہوا تھا۔ اسے شام کو واپس آنا تھا۔ پہلی تاریخ کا چاند کھیتوں کے کنارے کچھ دیر کے لئے ابھرا اور غائب ہو گیا۔ ہوا تیز جھکڑوں کی صورت میں چل رہی تھی۔ میں شام سے ہی گھر میں بیٹھا ہیر کے پرانے صفحوں کو لئی لگا کر ٹھیک کر رہا تھا۔ شیر بخت کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اسے درست کر دے۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد میرا دل ڈوبنے سا لگتا۔ مجھے شیر بخت کی فکر ہونے لگی۔ رات سخت سیاہ تھی اور ماں دوسرے کمرے میں بیٹھی چرخہ کاتتے کاتتے سو گئی تھی۔ میں نے اسے جگا کر چارپائی پر سُلایا اور دیئے کو گل کر کے پھر اپنے کمرے میں ہیر کے ورق ٹھیک کرنے لگا۔ دیئے میں تیل ختم ہو گیا تھا۔ کھلے دروازے میں سے ایک جھونکا آیا اور دیا گُل ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ ہیر کے ورق میں نے اکٹھے کر کے ایک طرف رکھ دیئے۔ میری طبیعت سونے کو

بالکل نہیں کر رہی تھی۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ شیر بخت ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ دور سے کتے بہت ہی منحوس آواز میں بھونک رہے تھے۔ ماں بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں بھی وہ ایک مدھم سی روشنی سے چمک رہی تھی۔ اس کی دھار کو انگلی پر رکھا اور دروازے کو اپنے پیچھے بند کر کے اندھیری گلیوں میں سے کتوں سے بچتا ہوا دوسرے گاؤں کو جانے والی راہ پر ہولیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں تلوار کو یک ہاتھ میں تھامے گاؤں سے آنے والے راستے پر درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا چیختی چلاتی راستوں پر سے گزر رہی تھی اور دُور کتے اسی منحوس آواز میں بول رہے تھے۔ میرا دل سینے میں ٹھہرا ہوا لگتا تھا۔ کوئی بات کوئی خیال میرے ذہن میں نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسا لگا جیسے کوئی باتیں کرتا ہوا آ رہا ہو۔ آواز ہوا کے رخ سے آ رہی تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ تلوار کو مضبوطی سے تھامے تھے۔ لڑکی کا دوپٹہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ جسے وہ اپنے جسم کے گرد لپیٹے ہوئے ہنس رہی تھی۔ اور مرد کچھ دور بالوں کو اپنے ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔ وہ خاموش تھا۔ شاید وہ

تمام باتیں ایک دوسرے کو کہہ چکے تھے۔ یا ان کے پاس کہنے کو کہنے کو ہی کچھ نہ تھا۔ شاید وہ تمام باتیں ایک دوسرے کو کہہ چک تتھے۔ یا ان کے پاس کہنے کو ہی کچھ نہ تھا۔ میں ان سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میرے دل کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ وہی تھی۔ اس ہوا کے شور میں بھی اس کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد مجھے تب ہوش آیا جب وہ مرد کھیت کی منڈیر کے پاس گر پڑا۔ میری تلوار اس کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر چکی تھی۔ لڑکی بے تحاشا گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر بھاگ رہی تھی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر وہ میرے پہنچنے سے پہلے گاؤں میں داخل ہو گئی۔ گاؤں کے پاس پہنچ کر میرے قدم رک گئے۔ خون آلود تلوار ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں واپس آ گیا۔ اُس رات گہری نیند سویا۔ ابا کے بعد یہ پہلا دن تھا جب میری آنکھوں میں نیند خود آئی تھی۔

صبح ابھی اذان ہو ہی رہی تھی کہ بہت سے مرد ہمارے گھر کے سامنے رُکے۔ ماں دودھ بلو رہی تھی۔ میرا دل گھر سے باہر نکلتے ہوئے گھبرا

رہا تھا۔ وہ شیر بخت کو لائے تھے۔ وہ گھوڑے پر نہیں بلکہ چارپائی پر تا۔ کسی نے اسے کھیتوں کے پاس قتل کر دیا تھا۔ اس کی لاش صحن میں تھی۔ ماں بے ہوش اس کی چارپائی پر گری ہوئی تھی۔ اور میں دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ میری ساری طاقت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ صبح کھیتوں کو جاتے ہوئے انہوں نے اسے وہاں پڑے پایا تھا۔ نہ جانے کون اس کا دشمن تھا۔ سارا گاؤں ہمارے گھر کے سامنے تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ لئے۔ سَر کو دیواروں سے مارا۔ میرا بھائی شیر بخت مجھے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ اور ساتھ ہی ماں بھی۔ اس کی بے ہوشی کے بعد ماں نہیں بولی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اسے شیر بخت سے پیار جو بہت تھا۔ شیر بخت جس کی دلہن نے آ کر ماں کے گھر کو روشن کرنا تھا۔ جس کے لئے ماں نے زیور بنوائے ہوئے تھے۔ وہ ساری روشنیاں تو ایک دم ہی بجھ گئی تھیں۔ ماں کے دل میں سہرے کے گیت اس کے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ چکے تھے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔ میں نے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لوگ دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ تھوڑی دیر

بعد پولیس آئی، مگر قدموں کے نشان تو رات کی آندھی کہیں سے کہیں لے جا چکی تھی۔ ہمارا تو کوئی بھی دشمن نہ تھا۔ پھر شک کس پر ہوتا۔ یوں اس رات کھیتوں کو پار کرتے دو جنازے اس ٹیلے پر آ کر رکے اور دو قبریں دو مقبرے تعمیر ہو گئے۔ دو انسانوں نے ایک ساتھ موت کو قبول کر لیا۔ دوسرے دن زینو کا جنازہ گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ لوگ شیر بخت اور زینو کا جنازہ گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ لوگ شیر بخت اور زینو کے نام کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہانی بنی یا نہیں۔ اس کا مجھے کب ہوش تھا۔ میں گھر میں بند پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ لوگ میرے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ پولیس ابھی تک قاتل کی کھوج میں تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس تلوار کو پکڑ کر اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہا۔ مگر اس تلوار کو چھوتے ہوئے مجھے خوف لگ رہا تھا۔ میں نے اس خون کو اپنے ماتھے پر لگانا چاہا۔ میں نے اس کو چومنا چاہا۔ مگر ہر دفعہ میری ساری ہمت مٹی کے ڈھیر کی مانند ڈھے جاتی۔ رات نے سب طرف خاموشی پھیلا دی۔ لوگ گھر کے سامنے بیٹھ کر جا چکے تھے، وہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے۔ شیر

بخت اور زینو جا چکے تھے۔ مگر میں ہمیشہ کی آگ میں جلنے کے لئے زندہ رہا۔ زینو مٹی کے نیچے تھی جس کو چھونے کی تمنا میں میں نے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اب جب وہ میری دسترس سے باہر جا چکی تھی۔ میں اسے پا سکتا تھا۔ اس کو چھو سکتا تھا۔ اسے اپنی گرفت میں لے کر چل سکتا تھا۔ زینو اب میری تھی۔ شیر بخت کی قربانی بھی اس لمحہ میرے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ میں دبے پاؤں بیلچہ اٹھائے قبرستان کو چل پڑا۔ درخت خاموش تھے۔ ہوا تھمی ہوئی تھی اور ہوا میں نئی کھدی ہوئی مٹی کی باس رچی ہوئی تھی۔ اس کی قبر پر مٹی کے پھول تھے۔ اس کے سرہانے دیا جل رہا تھا۔ میں قبر کے پاس پہنچا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ وہ میرے اس قدر پاس تھی۔ دور مجاور کی کوٹھڑی میں دِیا مدھم لَو میں جل رہا تھا۔ پسینے کے قطرے میری ایڑیوں پر ٹپک رہے تھے۔ میں ہانپ رہا تھا۔ بیلچے کی آواز آ رہی تھی۔ نرم مٹی بغیر محنت کے ہٹ رہی تھی اور پھر وہ میرے سامنے تھی۔ سفید لباس میں لپٹی وہ وہاں لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے کسی بات کا احساس نہ تھا۔ مجھے ماں اور شیر بخت کوئی بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تلوار پر لگا ہوا خون بھی یاد نہیں تھا۔ وہ میرے پاس تھی۔ اب میں اسے

چھو سکتا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی، مگر اس کو کچل دینے کی طاقت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے ایسے لگا، جیسے میں ایک بوجھ کے نیچے دب رہا ہوں۔ میرے دل میں ایک دم خوف پیدا ہوا۔ مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے بازو بوجھ کی وجہ سے جھک رہے تھے۔ میں نے اسے زمین پر لٹا دیا اور قبر کو ہموار کر دیا۔ وہ اندھیرے میں غیر مرئی روح کی مانند مجھے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ کسی نے میرا نام پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پاس کے درختوں میں کوئی سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور زینو وہیں لیٹی ہوئی تھی۔ پھر کسی نے میرے کان کے پاس میرا نام پکارا۔ یہ آواز شیر بخت کی تھی۔ میں نے زینو کو کندھے پر ڈال لیا۔ دوسرے ہاتھ میں بیلچہ پکڑا اپنے کھیتوں کو چل پڑا۔ ایک انجانی خوشی کا احساس سب طرف چھا رہا تھا۔ میں غیر مانوس راہوں سے ہوتا آ رہا تھا۔ زینو کے سفید لباس سے ہوا چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ جب میں ٹیلے پر پہنچا، تو رات سوا پہر گزر چکی تھی۔ کہیں سے مرغ کی آواز آ رہی تھی۔ میرے جسم سے آگ نکل رہی تھی۔ میں نے شیر بخت کے

پہلو میں ایک اور قبر کھودی اور زینو کو اس میں لٹا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے شیر بخت میرے پاس کھڑا ہو۔ اس کے سانس لینے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میرا دماغ خالی تھا۔ صبح لوگوں نے مجھے ایک تیسری قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے دیکھا۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ آنکھیں ڈراؤنی لگ رہی تھیں اور جسم انتہائی تپش سے جل رہا تھا۔ میں اس لٹے قافلے کا نشان تھا جس میں زینو، شیر بخت اور ماں تھے۔ مگر اب تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ان کو منزل سے بھٹکا دیا تھا۔ لوگ سمجھتے میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ تیسری قبر میرے پاگل پن کی نشانی تھی۔ اگر میں پاگل ہوتا تو اس دکھ تو اس دکھ میں سے گزرنے سے بچ جاتا جس میں میرا انگ انگ بھسم ہو رہا ہے۔ میرا دکھ تو دیپک راگ ہے جس کی آگ میں جل کر دوبارہ جلنے کے لئے جنم لیتا ہوں۔ یہ چکر نہ جانے کب تک چلتا رہے گا۔ اس لمحے سے لے کر آج تک میں ایک دفعہ بھی اپنے آپ کو بھول نہیں پایا۔ وقت نے ان قبروں کو بوسیدہ کر دیا ہے، مگر میرے دل میں آج تک وہی گرمی ہے۔ چاندنی راتوں میں جب ہوائیں چلتی ہیں تو میں اسی طرح کھیتوں کی منڈیروں اور غیر مانوس

پگڈنڈیوں پر گھومتا رہتا ہوں۔ زینو اب بھی مجھے دکھائی دیتی ہے، مگر میں نے اس آخری وقت میں اسے چھوڑ کر اس کی ساری نرمی کو اپنے میں جذب کر لیا ہے۔ میرے بازوؤں پر آج تک وہ بوجھ ہے۔ اب میں اس کے پیچھے نہیں بھاگتا دور سے کھڑا دیکھتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ وہ ہوا میں غائب ہو جاتی ہے۔ ہر رات قبروں پر دیئے جلتے اور بُجھ جاتے ہیں۔ میرے دل میں کبھی روشنی نہیں ہوتی۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ ان قبروں تک میرے کھیتوں کی اور میری زندگی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔ پُر دا ہوا اب بھی چل رہی ہے اور چند صبح کی روشنی میں بے جان نظر آ رہا ہے۔ قبروں کے دیئے تو کب کے بجھ چکے ہیں۔